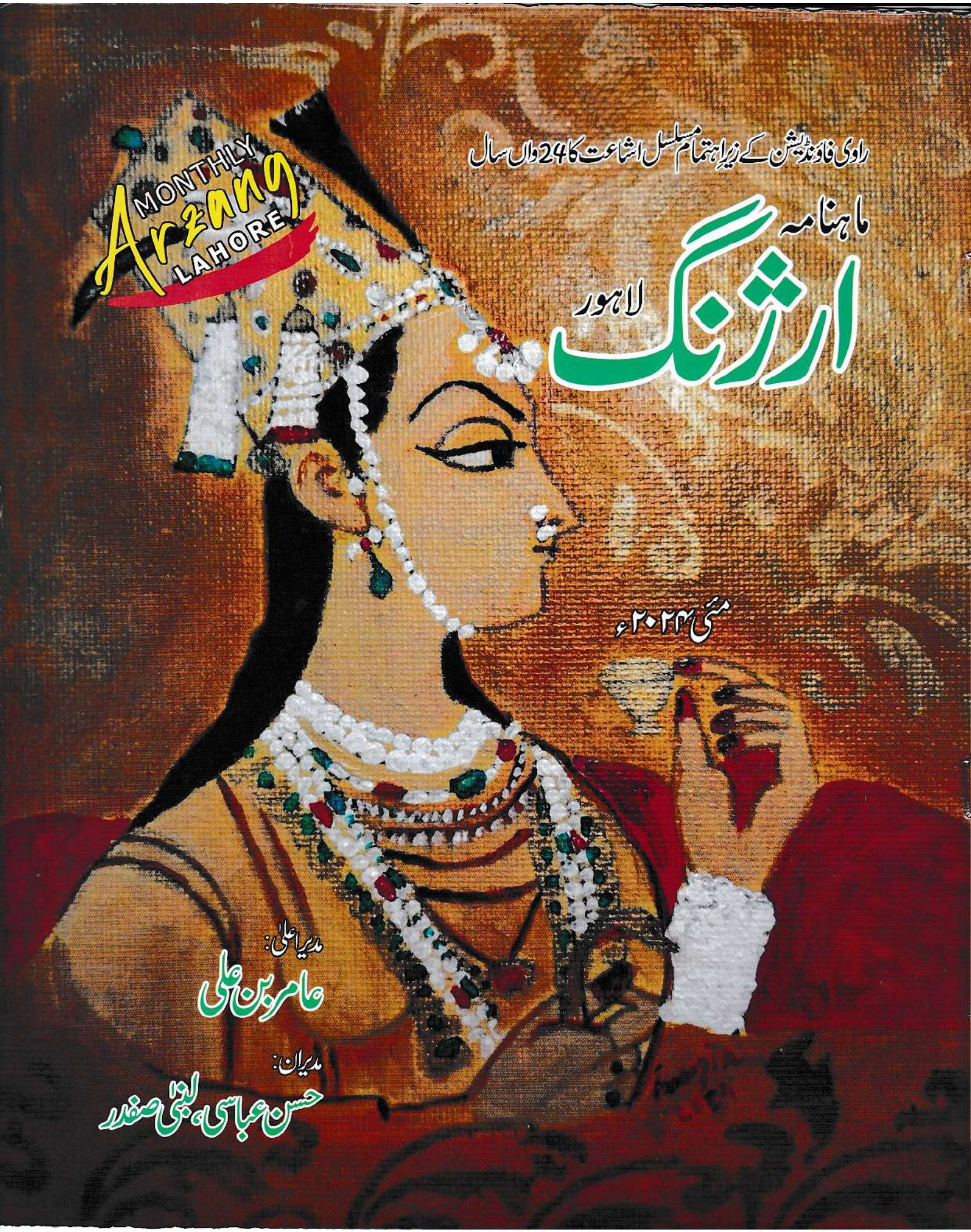

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

مئی ۲۰۲۴ء

مدیرِ اعلیٰ:

عامر بن علی

مدیران:

حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

جب زندگی میں مقصد ہو تو انسان درست راستے پر رہتا ہے

میری ہر کتاب کے پیچھے ایک کہانی ہے

قاسم علی شاہ

عہد ساز مفکر، مدبر، استاد، سخن ور اور سماجی کارکن

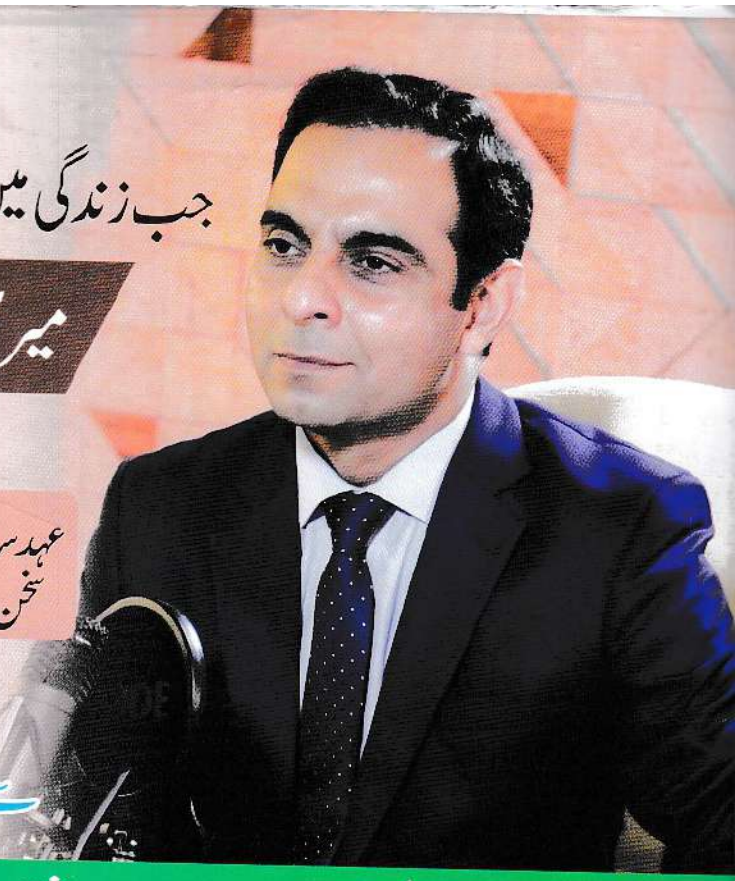

سے عامر بن علی اور ڈاکٹر عائشہ عظیم کی خصوصی گفتگو

پڑھانا میرا عشق ہے اور میں اسے اپنا فخر سمجھتا ہوں، نقطے سے نقطہ مل کر ہی ایک تصویر بناتا ہے

ہماری آج کی مہمان شخصیت ایک فرد نہیں بلکہ ایک تحریک ہیں۔ آپ ایک استاد ہیں، کارپوریٹ ٹرینر ہیں، نوجوان نسل کی تربیت ان کا مطمع نظر ہے۔ کام ان کا عشق ہے اور عشق ان کا کام ہے۔ لوگ ان سے جینا سیکھتے ہیں، لوگ ان سے بولنا سیکھتے ہیں، ہم بات کر رہے ہیں جناب قاسم علی شاہ کی۔ بغیر کسی طویل تمہید کے قارئین ارژنگ کی خدمت میں ان سے ہونے والی خصوصی نشست کے دوران کیے گئے سوال و جواب پیش کرتے ہیں۔

ارژنگ: آپ بنیادی طور پر انجینئر ہیں مگر آپ نے تحریر و تقریر اور تدریس کے شعبے کو ترجیح دی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

قاسم علی شاہ: یہ میری زندگی کا انتہائی خوبصورت وقت تھا جب میں اسے یاد کرتا ہوں۔ مگر جب میں اس وقت کے حالات میں خود کو کھڑا کر کے دیکھتا ہوں تو تب یہ انتہائی مشکل وقت تھا۔ کیونکہ بعض اوقات تبدیلی کا وقت بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے کہ آپ خود کو اسے سمجھا نہیں پا رہے ہوتے۔ اس وقت میں اس کو معنی نہیں دے پا رہے ہوتے، پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی کوئی شکل بنتی ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرا یہ وہ زمانہ تھا جب میرے سامنے دو بڑی جدوجہدیں یا مجاہدے تھے۔۔۔۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

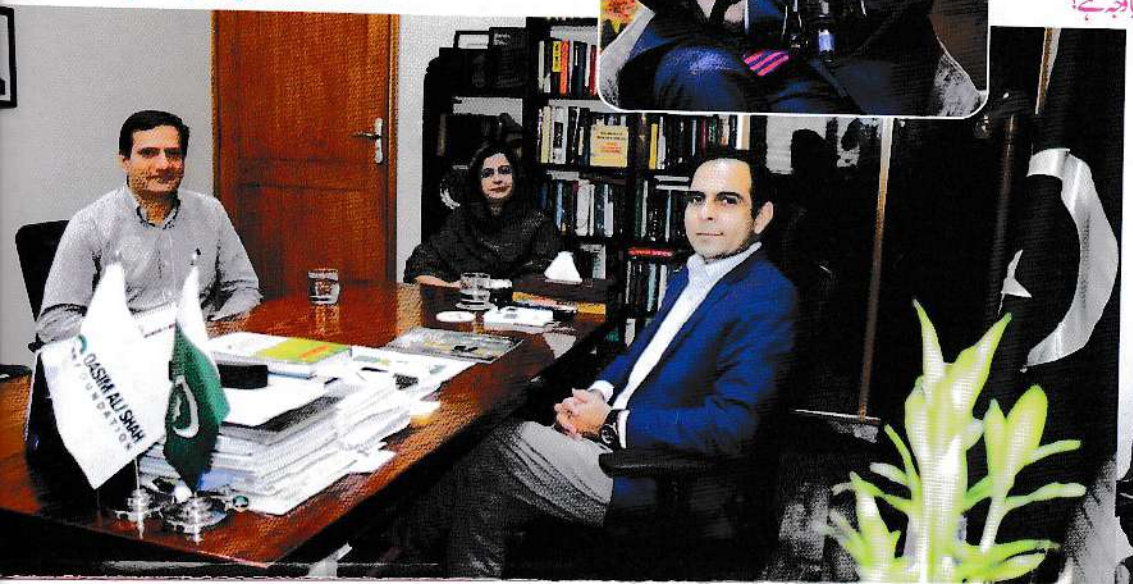

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

مئی 2024 شمارہ 5

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

سرورق: ڈاکٹر فوزیہ فاروق آکسفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، 2

مضامین:

- ذاتِ الٰہیہ کا وحدت الوجودی تصور / بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر ، 3
- مذہب اور تعقل کے روابط / قیصر نجفی ، 7
- جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل۔ایک ہمہ جہت عبقری شخصیت / میاں نذیر اختر ، 10
- اُردو اور آرمینی زبان کے روابط / خاور اعجاز ، 14
- ''جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں'' / نسیم سحر ، 22

رپورٹ: تخلیق ایوارڈ / سونان اظہر ، 23

شعری گوشے: فیصل عجمی، شاہد ماکلی 24 تا 25

مضامین: ○ ایک میں پانچ / عبدالوحید بسمل ، 26

طنز و مزاح: ○ ابنِ بطوطہ کا بھائی / ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ، 28

- جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں / مرزا کاظم رضا بیگ ، 30
- بیسویں صدی میں اُردو غزل کے عمومی رجحانات / لبنیٰ صفدر ، 32

انٹرویو: قاسم علی شاہ ، 34

انٹرویو: ڈاکٹر ایوب ندیم ، 37

افسانے: ○ کھوکھلی دیوار / عذرا اصغر ، 43

- دُکھ کی طاقت / انجینئر ظفر محی الدین ، 45
- سفرنامہ: پت جھڑ کی چاپ / عامر بن علی ، 46
- خاکہ: امی آپ کی عظمت کو ڈھیروں سلام / آئینہ مثال ، 47
- مختصر ادبی خبریں ، 48

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد ونعت

حمد

اس کی مدحت کو قلم تحریر کر سکتا نہیں
حرف موجِ نور کو زنجیر کر سکتا نہیں
ذہن ودل کا مرکز ومحور نہ ہو جب تک وہ ذات
کوئی اپنی ذات کی تعمیر کر سکتا نہیں
لا سے اللہ تک گر لو نہ دے اس کا جمال
منزلوں کا فیصلہ رہ گیر کر سکتا نہیں
عشق نے روشن کیے ہیں آگہی کے جو چراغ
کوئی جھونکا ان کو بے تنویر کر سکتا نہیں
پل میں سو موسم بدل دیتی ہے اس کی اک نظر
کب وہ سب کو صاحب تقدیر کر سکتا نہیں
ہر عمل منسوب ہو جس کا خدا کے نام سے
کوئی اس انسان کو تسخیر کر سکتا نہیں
معرفت اسمِ محمدؐ کی نہ ہو جب تک اُمید
آدمی قرآن کی تفسیر کر سکتا نہیں

اُمید فاضلی

نعت

ہو شاداں و فرحاں ، غلامِ محمدؐ
ہو قسمت پہ نازاں غلامِ محمدؐ
نبی پاکؐ کا حق ہے توقیر و عزت
خدا چاہے خود احترامِ محمدؐ
درود انؐ پہ پڑھ کے سلام انؐ کو بھیجو
تمہیں پھر ملے گا سلامِ محمدؐ
سب ایمان لے آئیں دل کی خوشی سے
سمجھ لیں جو انساں پیامِ محمدؐ
رہِ حق پہ قائم وہ رہتا ہے دائم
رہے یاد جس کو پیامِ محمدؐ
غریبوں یتیموں کے غم کا مداوا
ہو قائم جہاں میں نظامِ محمدؐ
تصوّف اُٹھا کے شریعت کے پردے
دکھاتا ہے حُسنِ نظامِ محمدؐ
ہوائے نفس سے نہیں بولتے وہ
رضائے خدا ہے کلامِ محمدؐ
ہے رنگِ کلامِ الٰہی جدا ہی
جداگانہ رنگِ کلامِ محمدؐ
جہاد انؐ کی سیرت کا رنگِ حقیقی
یہی ہے حقیقی پیامِ محمدؐ
ہے روضۂ اطہر پہ بہتر خموشی
میرے اشک ہوں ہمکلامِ محمدؐ
تمہیں فکر ہو گی نہ محشر کی اخترؔ
جو بن جاؤ سچے غلامِ محمدؐ

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

اس سے بڑھ کر ہو بھلا میرے لئے کیا معراج!
مُجھ کو ہے اُن ﷺ کا ہر اک نقشِ کفِ پا معراج
خاکِ طیبہ میں مِلا ذرّۂ خاکی میرا
ہو گیا قطرے کو کیا خوب یہ دریا معراج!
روشنی بن کے جو ہے لوحِ ابد پر تحریر
قابَ قوسَین کا وہ زندہ حوالہ معراج
ہفت افلاک بھی نازاں تھے کہ لائے تشریف
شہِ والا کہ جو خود بھی تھے سراپا معراج
مَیں مدینے کا مسافر ہوں، جدھر بھی جاؤں
جو بھی ہے میرا سفر، اُس کی مدینہ معراج
نعت لکھتے ہوئے کہتا رہا مَیں صلِ علیٰ
پا گیا نعت نگاری کا سلیقہ معراج
جب اُٹھیں دستِ دُعا میرے تو ہوتی ہے تسیم
درِ اقدس پہ حضوری کی تمنا معراج

نسیمِ سحر

نعتوں کا مرے لب پر محبوبؐ ترانہ ہے
جو ذکرِ ملائک ہے اور وِردِ ربّانہ ہے
طیبہ کے تصوّر سے آنکھوں کو رہے سیری
دل کھنچتا رہے، سمجھو الطافِ جانانہ ہے
بیمارو، گنہ گارو! آؤ شہرِ مدینہ میں
حاصل ہے مطبّ، دارو شافع بھی یگانہ ہے
مشتاق بڑے فرشی، ہیں چشم براہ عرشی
لگتا ہے کہ اللہ کے محبوبؐ نے آنا ہے
ہاتھوں میں ملائک کے مالائیں سلاموں کی
نورانی ہے ہر موسم، ہر رنگ دیوانہ ہے
مجھ ایسے خطاگر کو اُمت میں کیا منظور
کیٔا ماہِ طیبہ کا احسان خوبانہ ہے
نبیوں کا جو سرور ہے اور ساقیِ کوثر ہے
زہراؓ کا وہ بابا ہے حسنینؓ کا نانا ہے

عبدالقیوم زائر

ذاتِ الٰہیہ کا وحدت الوجودی تصوّر

بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر

انفرادیت کا کمال یہ ہے (یا ہونا چاہیے؟) کہ کسی جسم زندہ کا کوئی الگ ہونے والا حصہ بذاتہٖ اپنی ہستی برقرار نہ رکھ سکے۔ تاہم عمل توالد میں نہ صرف دو اجسام سے الگ ہونے والا جز ایک نئے جسم کی صورت میں تشکیل پا جاتا ہے۔ بلکہ اپنے مولد سے الگ تھلگ اپنی ہستی قائم بھی رکھ سکتا ہے۔ یہ جز قائم بالذات ہونے کی بنا پر ایک مزید ''انا'' کا ظہور ہے۔ اس نئی انا کے اپنے تقاضے ہیں۔ سابقہ انا اور نئی انا میں مفادات کا ٹکراؤ بھی ممکن ہے اور ذاتی تشخص کا ٹکراؤ بھی بعید از امکان نہیں۔ یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ایک ''انا'' سے تخلیق پانے والی نئی ''انا'' خود بھی مزید ''اناؤں'' کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ سب اوامر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ فردِ کامل کی ذات میں بھی خود اُس کا دشمن یعنی (حریف اور رقیب) موجود ہے۔ لہٰذا ہم اللہ کی ذات کا تصور کریں گے تو یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس کی ذات توالد و تناسل سے بالاتر (لم یلد ولم یولد) ہے اور مزید یہ کہ کوئی اُس کا ہم مرتبہ اور ثانی نہیں یعنی وہ کُفُوًا اَحَد (ہر لحاظ سے بے مثل و یکتا) ہے۔

توالد و تناسل سے پاک اور بالاتر ہونے کی بنا پر اللہ کی صفت ''انفرادیت'' نہیں بلکہ ''یکتائی'' ہے۔ جب کہ توالد و تناسل کے باعث انسان کی انفرادیت نے عمومی حیثیت اختیار کر لی ہے اور مکمل انفرادیت کی حیثیت مجروح ہوئی ہے۔ علامہ اقبال نے اگرچہ انسانی خودی کو بھی ہر فرد کے لیے ''یکتا'' قرار دیا ہے۔ تاہم اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ہر انسان کی خودی کا اپنا علاحدہ تشخص ہے اور ہر فرد ایک علاحدہ انا کا مالک ہے یعنی دو افراد کی ''خودیاں'' یا ''انائیں'' ایک جیسی خصوصیات نہیں رکھتیں۔ اسی لیے علامہ کا فرمانا ہے کہ نقال اور ایکٹر جب دوسرے کرداروں کی تمثیل پیش کرتے ہوئے ان کا رُوپ اختیار کرتے ہیں تو یہ عمل ان کی ذاتی خودی کے تشخص کو مجروح کرنے کا باعث بنتا ہے۔ مندرجہ بالا بحث کو چند سطور میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ توالد و تناسل کا سلسلہ انفرادیت کی صفت کے منافی لیکن نسل انسانی کی بقا کے لیے ناگزیر ہے چاہے اس سے انفرادیت کسی حد تک زائل ہو کر عمومیت میں تبدیل ہو جائے۔ اُس کے برعکس چونکہ اللہ اپنے لیے ایسی ضرورت سے بے نیاز (صَمَد) ہے۔ لہٰذا اُس کی انفرادیت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ انسان کی نامکمل انفرادیت اور اللہ کی مکمل انفرادیت میں فرق روا رکھنے کے لیے اللہ کی انفرادیت کو یکتائی یا (Uniqueness) کہا جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اللہ اس صفت کی بنا پر ''احد'' ہے جس میں یہ تمام خصوصیات یک جا ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً اللہ کی ذات کا یہ تصور ہر لحاظ سے درایت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔

اب ہم مذکورہ مضمون کے اس حصے کی جانب آتے ہیں جو موضوع کی حیثیت سے کسی خارزار سے کم نہیں تاہم اس سے صرفِ نظر بھی ممکن نہیں۔ فاضل مضمون نگار نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بحث کرتے ہوئے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ خود بھی ان دو نظریات کو درست مانتے ہیں۔ یہ ایک سراسر علمی بحث ہے اور اگر موصوف ان نظریات کے قائل ہیں تو اس پر بھی کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ تاہم بقول اقبالؒ ''ان معاملات پر فکر کا تعلق انسان کی سوچ کی اُڑان تک محدود ہے اور ہمارے لیے ''فرد'' کا ٹھیک ٹھیک تصور کرنا آسان بات نہیں۔'' لہٰذا خدا کی ذات کا تعین صرف اس کی صفات کی حد تک ہی ممکن ہے۔ علامہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں۔ اسی لیے وہ اپنے بعد آنے والے لوگوں سے فکر مزید کی توقع رکھتے ہیں ''وحدت الوجود اور وحدت الشہود'' کو محض اس لیے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ ''جو بزرگ ان نظریات کے قائل رہے ہیں ان کی یاد بہت احترام و عقیدت سے منائی جاتی ہے۔'' علامہ نے خود فرمایا ہے کہ ''..... یہ وہ تعبیریں ہیں جو فکر نے اپنے رنگ میں کی ہیں، ان کا کوئی مستقل وجود نہیں کہ اپنے سہارے آپ قائم رہ سکیں۔ وہ محض عقل کے تعینات ہیں۔'' اسی نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ آج کے مفکرین کی سوچ بھی ضروری نہیں کہ آئندہ عشروں میں درست قرار پائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک عام باعمل مسلمان کے لیے اتنی گہرائی تک جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر وہ اللہ کی ذات کو اُس کی صفات کے حوالے سے جانتا اور اُسے معبودِ حقیقی سمجھتے ہوئے اُس کے احکام پر عمل پیرا ہوتا ہے تو اُس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ایک عامی کو نہ تو ان دو نظریوں کی حقیقت کا علم ہے اور نہ ہی وہ ان کے مضمرات سے آگاہ ہے۔ اس کے لیے اتنی بات ہی باعث اطمینان ہے کہ ''فلاں بزرگ نے یوں فرمایا ہے'' داتا گنج بخش کی شہرۂ آفاق تصنیف ''کشف المحجوب'' میں نہ تو وحدت الوجود کا عکس دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کسی اور متنازعہ نظریے کا لیکن ان کے پیروکاروں کی بھی ایک کثیر تعداد ہے۔ لہٰذا عقیدت و احترام کو کسی نظریے کی درستی کی کسوٹی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ایسا کوئی بھی نظریہ دین اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اُس کی روح سے مطابقت رکھتا ہے یا اُس سے متصادم ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے حضرت بایزید بسطامی کے جس قول کا اقبال کے حوالے سے ذکر کیا ہے اُسے غالب جیسے وسیع المشرب شاعر نے ایک مصرعے میں یوں بیان کیا ہے کہ ع نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا

ہوتا۔ اسی طرح وحدت الوجود کے حوالے سے ان کا ایک گنجلک شعر بھی پیش خدمت ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

واضح رہے کہ ''وحدت'' کا نقیض ''کثرت'' ہے اور ''توحید'' کا نقیض ''شرک'' ہے۔ مرزا غالب جب خود کو ''موحد'' قرار دیتے ہیں تو اُس سے ان کی مراد ''توحید'' نہیں بلکہ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والا ہے۔ رسوم سے ان کی مراد ظاہری اور بدنی عبادات ہیں جو ان کے نزدیک محض (Rituals) ہیں۔ لہٰذا جب مختلف ادیان کو ماننے والے اپنی انفرادی شناخت ختم کر دیں گے اور اپنی مذہبی رسومات کو ترک کر دیں گے تو وہ مرزا غالب کی طرح ''وحدت الوجود'' یا ''ہمہ اوست'' کے عقیدے پر ایمان لے آئیں گے اور تمام ادیان ایک ہو جائیں گے۔ یہ عقیدہ (Monotheism) یا توحید کی نفی کرتا اور (Pantheism) یا ''کثرت میں وحدت'' (Unity in diversity) کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس نظریے کی ابتدا افلاطون کے شاگرد فلاطینوس (Plotinus) کی تعلیمات سے ہوئی جو کہ درحقیقت اپنے استاد کی تعلیمات کی نفی کرتا تھا اور اصطلاحاً اُسے (Renegade) قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعد میں آنے والے یونانی فلاسفہ سے یہ عقیدہ مسیحی دنیا نے مستعار لے لیا۔ یہی عقیدہ بعد ازاں ایران اور برصغیر ہندوستان میں بھی مقبول ہو گیا۔ محی الدین ابن عربیؒ اپنے قیامِ ہندوستان کے دوران میں لوگس (Logos) یا ذاتِ بحت کی اس نئی تعبیر سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے یہ نئی تعبیر عرب ممالک میں بھی متعارف کروادی۔

بدقسمتی سے یہاں دیارِ غیر میں میرے پاس حوالے کی ایک کتب کی دستیابی کا مسئلہ ہے ورنہ قارئین کو درست حوالہ جات بھی فراہم کرنا ممکن ہوتا۔ اس دقیق مضمون کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے ہم ایک بار پھر غالبؔ ہی کے دو اشعار کا تجزیہ کرتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس شعر میں غالبؔ نے پھر یہی تصور پیش کیا ہے کہ ماسوا ''اللہ'' جو کہ ''قائم بالذات'' ہے، ہر چیز ''عرض'' (ع رَض) ہے۔ ''جوہر'' صرف اللہ کی ذات ہے تو پھر اللہ کے علاوہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگلا شعر اس سے بھی زیادہ گنجلک لیکن مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں؟

یعنی نظارہ، نظارہ کرنے والا اور جس کا نظارہ کیا جا رہا ہے وہ سب ایک ہی ہیں تو پھر نظارہ کرنے کے عمل کی حقیقت کیا ہے؟ غالب کا یہ شعر فارسی کے اس شعر سے مزید واضح ہو جائے گا کہ:

خود کوزہ و خود کوزہ گرو، خودِ گل کوزہ
خود برسرِ بازار خریدار می آید

یعنی وہ خود ہی مٹی کا پیالہ ہے، خود ہی یہ پیالہ بنانے والا ہے، خود ہی وہ مٹی ہے جس سے کہ یہ پیالہ بنایا گیا ہے اور خود ہی وہ پیالہ خریدنے کے لیے بازار میں چلا آیا ہے۔ یہ ہے حقیقت ''ہمہ اوست'' کی یعنی ماسوا اللہ کچھ بھی نہیں بلکہ ''وہ خود ہی سب کچھ ہے'' ناچیز کی دانست میں خالقِ حقیقی کے متعلق ایسے نظریات سراسر گمراہ کن اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہیں کہ خدا کو ہی ''سب کچھ'' سمجھتے ہوئے معاذ اللہ اُسے مٹی، پیالہ، پیالہ بنانے والا اور پیالے کا خریدار تک قرار دے دیا جائے۔

وحدت الوجود کی مزید وضاحت بابا بلھے شاہ کی شاعری سے ہو جاتی ہے۔ چند امثال درج ذیل ہیں:

کیہہ کردا، نی کیہہ کردا، کوئی پچھو دلبر کیہہ کردا،
ایہہ جو کردا سو کردا

وِچ مسیتے نماز گزاریں بت خانے جا وڑدا، آپے
اکو کئی لکھ گھراں دا مالک ایہہ گھر گھر دا

جت وِل ویکھاں اُت ول اوہو ہر اک دی سنگت کردا
موسیٰ تے فرعون بنا کے دو دو ہو کیوں لڑدا؟
اِکسے گھر وچ رسدے وسدے نئیں رہندا وچ پردا
وحدت دے دریا دے اندر سب جگ دِسے تردا
ایسی نازک بات کیوں کہندا نہ کہہ سکدا نہ جردا
بلھیا شوہ دا عشق بگھیلا رت پیندا گوشت چردا
کیہہ کردا نی کیہہ کردا کوئی پچھو دلبر کیہہ کردا

سرائیکی پر میری گرفت اتنی مضبوط نہیں۔ تاہم ان اشعار کا جو مطلب میں سمجھ پایا ہوں وہ کچھ یوں ہے:

''ہمارا محبوب کیا کرتا ہے، کوئی پوچھو کہ دلبر کیا کرتا ہے، وہ جو چاہے سو کرتا ہے۔ وہ خود مسجد میں نماز پڑھتا ہے اور پھر بت خانے میں جا گزیں ہو جاتا ہے۔ وہ خود تو ایک ہی ہے لیکن وہ لاکھوں گھروں اور ہر ہر گھر کا مالک ہے۔ جدھر بھی دیکھو صرف وہی نظر آتا ہے۔ وہ ہر کسی کا رفیق ہے۔ اس نے خود ہی موسیٰ اور فرعون کو بنایا ہے پھر وہ دونوں حریفوں کی جانب سے خود ہی لڑتا ہے یعنی خود اپنا ہی مدمقابل ہے۔''

مجھے تو وحدت کے دریا میں ہی تمام کائنات تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ راز ایک ہی گھر میں بسنے والوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ بلھے شاہ تم ایسی نازک بات کیوں کہہ رہے ہو جسے نہ تم کہہ سکتے ہو نہ ہی کہے بغیر رہ سکتے ہو کہ محبوبِ حقیقی کا عشق ایک بھیڑیے کی طرح عاشق کا خون پیتا اور اُس کا گوشت کھاتا ہے۔

ان اشعار کا مطلب بالکل واضح ہے کہ (معاذ اللہ) خدا خود ہی ایک جانب سے موسیٰ اور دوسری جانب سے فرعون بن کر دونوں جانب سے لڑائی کر رہا ہے۔ جبکہ موسیٰ اور فرعون بھی اُس کے اپنے روپ اور مظاہر ہیں۔ لہٰذا وہ درحقیقت اپنے خلاف خود ہی نبرد آزما ہے۔ وہ خود ہی کبھی مسجد میں نماز پڑھتا ہے اور خود ہی مندر میں بھی جا گھستا ہے۔ مجھے تو ہر جانب محبوب حقیقی ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسی نظریے کو غالب نے ''ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں'' کہہ

کر بیان کیا ہے۔

(Pantheism) یا ''وحدت الوجود'' کا عقیدہ قدیم رومنوں میں رائج تھا جس کے تحت وہ بلا امتیاز تمام دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اُس وقت یونان بھی رومن ایمپائر کا حصہ تھا۔ اس عقیدے کے مطابق کائنات اور خالق کائنات کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ تمام مظاہر فطرت ہی کو خالق کائنات کا جز سمجھتے ہوئے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ گویا کائنات پرستی کو ہی مطلق الیغو (Absolute Ego) کی عبادت قرار دیا جاتا تھا۔ یہی روایت ہندوؤں میں بدرجۂ کامل رائج تھی کہ طاقت، قوت، جبروت، عظمت، خوف کے ہر مظہر اور فائدہ یا نقصان پہنچانے والی ہر شے کو دیوی یا دیوتا سمجھتے ہوئے اُس کی پوجا کی جائے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، ناگوں چشموں سے لے کر گائے، پیپل اور برگد کے درخت دریائے گنگا، ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑ وعلیٰ ھذا القیاس تمام مظاہر فطرت کو بھگوان کے اوتار سمجھ کر اُن کی پوجا کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر منور مرزا کی تحقیق کے مطابق ہندو مت میں دیوی دیوتاؤں کی کل تعداد ایک کروڑ سے زائد ہے۔ اگر یہ کائنات ''ذات بحت'' کی تخلیق نہیں بلکہ اس کی ذات ہی کا ایک حصہ ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ کائنات جس مادے سے بنی ہے وہ بھی ''ذاتِ بحت'' جتنا ہی قدیم ہے۔ جبکہ علامہ اقبال نے اپنے تیسرے خطبے میں فرمایا ہے کہ عالم مادیات کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ شروع ہی سے موجود ہو۔ فلاسفہ اور علمائے دین کے مطابق ''قدیم'' صرف اللہ کی ذات ہے باقی ہر چیز بشمول مادے کے ''حادث'' ہے اور اقبال کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ وحدت الوجود کے نظریے میں ایک مزید اشکال یہ ہے کہ خالق کی ذات سے الگ ہونے والا ہر جزا اپنی مادی موت کا منتظر ہے تاکہ دوبارہ کل میں جذب ہو سکے۔ اگر یہ ''جز''، ''کل'' سے علاحدہ ہونے والے حصے تسلیم کر لیے جائیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ''کل'' نامکمل ہے جب تک کہ یہ اجزاء دوبارہ کل میں ضم نہ ہو جائیں۔ یہ بات خالق کی کاملیت (Perfection) کی صفت کے خلاف ہے۔ لہٰذا منطق، دلیل، استدراک اور درایت کے جس اصول پر بھی پرکھا جائے ''ہمہ اوست'' کے نظریے کا بودا پن ظاہر ہوتا ہے۔ عالم مادیات نہ تو اللہ کی ذات کا حصہ ہے، نہ اللہ کی طرح قدیم ہے اور نہ ہی قائم بالذات ہے بلکہ اقبال کے الفاظ میں ''زمان و مکان اور مادہ بجائے خود ذاتِ الٰہیہ کی آزاد تخلیقی فعالیت کی وہ تعبیریں ہیں جو فکر نے اپنے رنگ میں کی ہیں۔''

جب شاعر یہ کہتا ہے کہ ع ہر گل میں ہر شجر میں محمدؐ کا نور ہے..... تو اس میں عقیدے سے زیادہ عقیدت اور محبت کا اظہار کرتا ہے۔ جب حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیمؓ نے وفات پائی تو اُسی دن چاند کو گہن لگا۔ کسی شاعر نے کہا کہ چاند ابراہیمؓ کے غم میں گہنا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا مت کہو۔ اللہ صمد ہے اور کائنات کے اپنے معمولات ہیں۔ انسانوں کے غم اور خوشیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے زبردستی ڈاکٹر نصیر احمد ناصر صاحب کو ان کے فلسفۂ جمال کے حوالے سے وحدت الوجودی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں حسن و جمال دیکھنے کے پس پشت یہ حدیث مبارک ہے کہ اللّٰہُ جمیلٌ و یُحِبُّ الْجمال (اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے) اگر اس سے ظاہری حسن ہی مراد ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی بدصورت انسان یا کریہہ الصورت مخلوق نہ ہوتی۔ بدیہی امر ہے کہ اس سے مراد حسن اعمال، حسن کردار اور حسرت فطرت ہے ویسے بھی ڈاکٹر ناصر صاحب نے ''نور'' کے حوالے سے بہت اچھی وضاحت فرمائی ہے کہ نور و ظلمات اللہ نے خلق کیے ہیں۔ اللہ نے یہ نہیں کہا کہ ''اللہ نور ہے'' بلکہ فرمایا کہ ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' یعنی یہ نور اللہ کی تخلیق ہے اور یہ کائنات اُس کے (تخلیق کردہ) نور سے حسن بداماں وجلوہ افروز ہے۔ (الانعام ۶:۱) اس وضاحت سے پہلے ڈاکٹر ناصر صاحب نے علامہ اقبال کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ''اقبال کو سورہ نور کی زیرِ نظر آیت فکر انگیز سمجھنے میں التباسِ ذہنی ہوا ہے..... انہوں نے نور سے خدا یا خودیٔ آخر مراد لی ہے جو غلط ہے۔'' مزید فرماتے ہیں ''جدید علم کی روشنی میں اس سے اللہ سبحان وتعالیٰ کی مطلقیت (Absoluteness) مراد لینا چاہیے نہ کہ اُس کی ہمہ جائی (Omni Presence) جو خود بخود وحدتِ وجود تک پہنچ جاتی ہے۔'' ان شذرات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر ناصر ''ہمہ اوست'' کے عقیدے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا یہ کہنا کہ فلسفۂ جمال بھی ''ایک طرح کا وحدت الوجود ہی ہے'' اگر علمی دیانت کے منافی نہیں تو غالباً عجز فہم پر مبنی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں حسن و جمال کا مشاہدہ کرنا اور تمام مظاہر فطرت کو ''ذاتِ بحت'' کا حصہ سمجھتے ہوئے ادیان کے فرق کو مٹا دینے کی تعلیم دینا، قاتل، منصف، جلاد اور سرِ دار چڑھنے والے تمام کرداروں کو خالقِ حقیقی کے مختلف روپ سمجھنا ہرگز ایک ہی بات نہیں۔ وحدت الوجود کا تصورِ ذاتِ الٰہیہ اتنا سادہ بھی نہیں جتنا کہ فاضل مضمون نگار نے بیان فرمایا ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں خالقِ حقیقی کے حسن و جمال کو دیکھنا اور خود خالق کی ذات ہی کو ذرّے ذرّے میں تقسیم کر دینا دو بالکل مختلف امور ہیں۔ بلھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت نے شاہ جہان اور اورنگ زیب کا دور پایا۔ شاہ عنایت مکمل طور پر ہندو ویدانتی فلسفے کے پیروکار تھے۔ بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ وحدت الوجود کے عقیدے نے ہندوستان میں جنم لیا اور سکندر اعظم کی بھارت سے واپس جانے والی افواج کے ذریعے یہ عقیدہ یونان کے فلسفیوں تک پہنچا جہاں سے یہ مسیحی اور بعد ازاں مسلم دنیا میں بھی مقبول ہو

گیا۔ شاہ عنایت کے انہی خیالات کی بنا پر بلھے شاہ کے سید النصب والدین، ان کے شاہ عنایت (ارائیں) کو مرشد بنانے پر بہت ناخوش تھے۔ شاہ عنایت نے مکتی حاصل کرنے کے جو مراحل اپنی تصنیف ''دستور العمل'' میں بیان کیے ہیں وہ سو فیصد ہندو فلسفے کی توسیع ہیں جس کا آخری مرحلہ ''پرماہما'' ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ تحقیق و تدقیق کے معاملات میں درست رائے قائم کرنے کے لیے اصل ماخذ کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیے۔ اُمید ہے کہ وہ نظریۂ وحدت الوجود کے اصل ماخذ سے آگاہ ہونے کے بعد اپنی سابقہ رائے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ کسی ماہنامے میں شائع ہونے والے مضمون میں اختصار کی حدود و قیود کی بنا پر اتنی ہی تفصیل ممکن تھی۔ تاہم راقم اپنے نقطۂ نظر کو منطقی انجام پر لانے کے لیے بلھے شاہ کے کلام میں سے چند نمونے پیش کرنا ناگزیر سمجھتا ہے:

ہن کس تھیں آپ چھپائی دا
کتے سُنت فرض دیندے ہو کتے ملاں بانگ بولیندے ہو
کتے رام دہائی دیندے ہو کتے متھے تلک لگائی دا
کتے چور ہو، کدھرے قاضی ہو کتے منبر تے بہ وعظی ہو،
کتے تیغ بہادر غازی ہو، آپے پر کٹک چڑھائیدا
ہن کس تھیں آپ چھپائیدا؟

ترجمہ: کہیں آپ ہمیں سنت فرض بتاتے ہیں کہیں ملا بن کر اذان دیتے ہیں۔ کہیں آپ خود ہی رام کا نام جپنے لگتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح ماتھے پر تلک لگا لیتے ہیں۔ کہیں آپ خود ہی چور ہیں کہیں آپ خود ہی قاضی بن کر کرسی انصاف پر بیٹھے ہیں۔ کہیں منبر پر بیٹھ کر وعظ دیتے ہیں کہیں شمشیر بدست غازی بن کر اپنے خلاف ہی لشکر کشی کر دیتے ہیں۔ آپ کس سے خود کو چھپا رہے ہیں؟

مولا آدمی بن آیا
آپے آہو، آپے چیتا آپے مارن دھایا
آپے صاحب آپے بردہ آپے مُل وکایا
مولا آدمی بن آیا

مولا آدمی کا روپ دھار کر آیا ہے وہ خود ہی ہرن ہے، خود ہی چیتا ہے اور خود ہی (ہرن کو) مارنے آیا ہے۔ وہ خود ہی آقا ہے، خود ہی غلام ہے اور خود ہی اپنی قیمت چکا رہا ہے۔ مولا ہی آدمی کا روپ دھار کر آیا ہے۔

کتہوں لامکانی دَسدے ہو
تُسی ہر رنگ دے وچ وسدے ہو
کتہوں لامکانی وسدے ہو
کن فیکون تیں آپ کہایا، تیں باجھوں ہور کیہڑا آیا؟
پُچھو آدم کس نے آندا ہے، کتھوں آیا تے کتھے جاندا ہے
او تھے کس داتیتوں لانجھا ہے، او تھے کھادانہ اٹھ نسدے ہو
آپے سنیں تے آپ سناویں آپے گانویں آپ، بجاویں
کتھوں قول سرود سنانویں کتھے جاہل ہو کے دسدے ہو
تیری وحدت توں ہی بجھاویں انا الحق دی تار ہلاویں/
سولی تے منصور چڑھاویں اتے کول کھلو کے ہسدے ہو
کتے رومی ہو کتے زنگی ہو کتے ٹوپی پوش فرنگی ہو/ کتے
مے خانے وچ بھنگی ہو کتے مہر مہری بن وسدے ہو
کتہوں لا مکانی دسدے ہو تسی ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

ترجمہ: ''آپ کس کو اپنا لامکانی ہونا بتا رہے ہیں؟ ہر رنگ میں آپ خود ہی بستے ہیں۔ آپ نے اپنے آپ سے ''ہوجا'' (کن فیکون) کہلوایا تو نتیجے میں آپ کی اپنی ذات کے سوا کیا کوئی اور بھی آیا؟ کوئی پوچھے کہ آدم کو وجود میں لانے والا کون ہے۔ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس منزل کی جانب جا رہا ہے۔ عرش پر بھلا آپ کو کیا چتایا پریشانی تھی کہ آپ خود ہی جنت میں دانہ گندم کھا کر وہاں سے فرار ہوئے ہیں۔ آپ خود ہی سناتے ہیں اور خود ہی سنتے ہیں۔ خود ہی گاتے ہیں اور خود ہی ساز بجاتے ہیں۔ کہیں علم و حکمت کے اقوالِ زریں سناتے ہیں کہیں جاہل بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ اپنی وحدت (وحدت الوجود) کا نکتہ خود ہی سمجھاتے ہیں اور تار ہلا کر منصور سے انا الحق کہلواتے ہیں۔ پھر منصور کو سولی پر چڑھوا دیتے ہیں اور خود پاس کھڑے ہو کر ہنستے رہتے ہیں۔ رومی، زنگی اور فرنگی سب آپ ہی کے رُوپ ہیں۔ کہیں آپ شراب خانے میں خاکروب بن جاتے ہیں کہیں کاشتکار اور اُس کی بیوی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ آپ کس کو اپنا لامکانی ہونا بتا رہے ہیں۔ ہر رنگ میں آپ خود ہی بستے ہیں۔''

اس شاعری میں اتنے کلمات کفر ہیں کہ قدم قدم پر استغفر اللہ کہتا آیا ہوں۔ باقی شاعری میں بھی اللہ کی شان کے خلاف انتہائی نازیبا کلمات شامل ہیں۔ راقم کو اپنی ذات کی حد تک تو یقین ہے کہ یہ تصورات سراسر غیر اسلامی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یورپ سے واپس آ کر ''ہمہ اوست'' کے عقیدے سے برأت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس بات پر اُن کی خواجہ حسن نظامی سے بہت تند و ترش مراسلت بھی ہوئی۔ اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ ''قرآن کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ سراسر زندیقیت ہے۔ میں تو اس سے تائب ہو چکا ہوں اللہ آپ کو بھی توبہ کی توفیق عطا کرے۔'' جب بات بہت بڑھ گئی تو اکبر الہ آبادی نے دونوں بزرگوں کو مزید مراسلت ختم کرنے پر آمادہ کیا۔ میرے محدود مطالعے کے مطابق یہ وحدت الوجود کی مختصر تاریخ، پس منظر، طائرانہ جائزہ اور مضمرات ہیں۔

بایں ہمہ آج بھی لاتعداد لوگ اس عقیدے کے اسیر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک خوبصورت شعر ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

یہ شعر بھی وحدت الوجودیت کے مطابق ''جز'' کے ''کل'' میں ضم ہونے کے تصور کا عکاس ہے۔ اس موقع پر کسی بزرگ کا کہا ہوا یہ جملہ صادق آتا ہے کہ ''وحدت الوجود برائے شعر گفتن خوب است''، یعنی شعر و شاعری کے لیے ''وحدت الوجود'' بہت اچھا موضوع ہے۔

مذہب اور تعقل کے روابط (''عقلیات معاصر'' کے آئینے میں)

قیصر نجفی/کراچی

''عقلیات معاصر'' علامہ طالب جوہری کی تصنیف ہے۔ انکا شمار ہمارے عہد کے یگانوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب ''جدید بیاض مرثیہ'' میں علامہ طالب جوہری کا درج ذیل الفاظ میں تعارف کرایا ہے:

''معروف دینی شخصیت و ذاکر علامہ طالب جوہری کا تعلق بہار کے مقتدر علمی خاندان سے ہے۔ ان کے جدامجد مولانا مسلم، حسین گنج سارن کے رہنے والے تھے۔ یہ گھرانہ برس ہابرس سے حسین گنج ہی میں آباد رہا لیکن طالب جوہری کی ولادت گورکھپور کی ہے۔ سن ولادت ۱۹۴۰ء ہے۔ ان کے والد مولانا محمد مصطفیٰ جوہر صاحب نامور علمی شخصیت تھے.....

ابتدائی تعلیم کے بعد طالب جوہری صاحب حوضۂ علمیہ نجف میں داخل ہوئے، جہاں سے انہوں نے سند اجتہاد حاصل کی۔ انتہائی جید علماء سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ جن میں آیت اللہ شہید باقر الصدر جیسی شخصیت کا نام بھی شامل ہے۔ کراچی میں وہ جامعہ امامیہ کے پرنسپل رہے اور منسٹری آف ایجوکیشن سندھ کے تحت کراچی کے ایک سرکاری کالج میں اسلامیات پر لیکچر بھی دیتے رہے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں اسلام کا معاشی نظام، علامات ظہور، عقلیات معاصر، احسن الحدیث اور حدیث کربلا جیسی کتب شامل ہیں۔ ''عقلیات معاصر'' مذہب اور تعقل کے روابط سمجھنے اور سمجھانے کی ایک بنیادی کڑی ہے۔ دینی تصانیف وعلوم کے ساتھ شاعری بھی ان کا ایک مضبوط حوالہ ہے۔ ''حرف نمو'' پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ جس کے بعد ''پس آفاق'' اور ''شاخ صدا'' بھی منظر عام پر آئے۔''

ڈاکٹر ہلال نقوی نے علامہ طالب جوہری کی تصنیف ''عقلیات معاصر'' کو مذہب اور تعقل کے روابط سمجھنے اور سمجھانے کی ایک بنیادی کڑی قرار دیا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی رائے پر صاد کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بھی ''عقلیات معاصر'' میں مذہب اور تعقل کے ربط ضبط کو ایک روشن اور واضح حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ البتہ اس تناظر میں انسان، دین اور خدا کے فطری تعلق کو اُجاگر کرنے کے لیے فلسفہ ومنطق کے جو باب قائم کیے گئے ہیں وہ نہ صرف ان علوم کے بعض مقدمات کی تفسیر وتعبیر کرتے ہیں بلکہ دقیق وگنجلک تراکیب ومرکبات لفظی کی تسہیل اور غرابت واجنبیت اصطلاحات کی تقلیل میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے علامہ طالب جوہری سے نیازمندانہ مراسم ہیں۔ ان کے تبحر علمی کے ہم قائل ہیں لیکن ''عقلیات معاصر'' نے فلسفہ میں ان کے درک کی جس بلندی کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر فائز ہونے کے لیے ریاضت ومجاہدہ کے کیا کیا نعمت خواں طے کرنے پڑتے ہیں..... اہل علم بخوبی جانتے ہیں۔ ایک ملاقات میں ہم نے ان سے کہا کہ فلسفہ کی طرف ذہنی رجحان دشوار پسند افتادِ طبع کی غمازی کرتا ہے۔ آپ تو پہلے ہی تفسیر قرآن، اصول حدیث، فقہ، تاریخ، اسماء الرجال اور اجتہاد ایسے علوم کے بھاری پتھر سہارے ہوئے تھے۔ ایسے عالم میں فلسفہ جیسے حوصلہ آزما علم اور اس کے پیچ در پیچ متعلقات پر کتاب لکھنے کی جرأت رندانہ حیران کن ہے۔ آپ کے نزدیک اس دشوار پسندی کی توجیہہ کیا ہے۔ ہمارا سوال سن کر علامہ صاحب متبسم ہوئے اور ارتجالاً بولے:

''فلسفہ پر کتاب لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ ایک سوال اکثر دل میں اُٹھتا رہتا تھا کہ کیا میں فلسفہ کے دقیق مسائل اُردو زبان میں بیان کر سکتا ہوں۔ ایک وقت آیا جب اس سوال نے ایک چبھن کی صورت اختیار کر لی۔ قبل اس کے کہ یہ چبھن کسی حسی اختلال کا باعث بنتی، میں نے اس تجربے سے گزرنے کا اپنا چیلنج قبول کر لیا۔''

علامہ طالب جوہری کی شخصیت کے بارے میں سوچیے تو ان کی شخصیت مذہب، خطابت اور ادب کی ایک متساوی الاضلاع مثلث بناتی ہوئی صفحہ ذہن پر اُبھرتی ہے۔ یقیناً اس حوالے سے علامہ صاحب کو اختصاص حاصل ہے کہ ان کی شخصیت کے تینوں ابعاد (Dimensions) رفعت و بلندی میں ہم پلہ ہیں لیکن افسوس کہ ان کی ادبی سربلندی بالخصوص شاعروں کے وقار واعتبار کا اعلیٰ ادبی سطح پر بقدر استحقاق اعتراف نہیں کیا گیا۔ بعینہٖ اسی طرح ان کی فلسفیانہ بصیرت کے ضمن میں بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ ''عقلیات معاصر'' پر ہماری نظروں سے تاحال (ڈاکٹر سیّد جعفر احمد کے فلیپ کے علاوہ) کوئی قابل ذکر تحریر نہیں گزری ہے۔

ہر چند ''عقلیات معاصر'' میں علوم منطق وفلسفہ کی مبادیات کے ابلاغ اور دقیق تراکیب و اصطلاحات کی تفہیم پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک مجموعی طور پر یہ کتاب اللہ تبارک وتعالیٰ کے اثبات وجود ووحدانیت کی منطقیانہ توجیہات اور ادیانِ عالم کے فلسفیانہ تقابل کی مساعی پر محیط ہے۔ ڈاکٹر سیّد جعفر احمد ''عقلیات معاصر'' کے فلیپ میں رقم طراز ہیں:

''علامہ طالب جوہری کی کتاب ''عقلیات معاصر'' ہمیں علمائے سلف کی یاد دلاتی ہے۔ جن کے یہاں منطق وکلام اور فلسفہ شجر ہائے ممنوعہ نہیں تھے۔

بلکہ جنہوں نے ان شعبوں میں غیر معمولی درک حاصل کر کے اس کو خود مذہب کی خدمت کا ذریعہ بنایا۔ زیر نظر کتاب میں فلسفے کے ادق مسائل کو انتہائی سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور پھر منطق اور فلسفے کی روشنی میں مذہبی عقائد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

ہماری معلومات کے مطابق علامہ طالب جوہری کا نوعمری سے ہی علم الکلام کی جانب میلان طبع تھا۔ ان کی فلسفہ پسندی کے ثبوت کے طور پر بیسویں صدی کے ممتاز فلسفی برٹرینڈ رسل Bertrand Russell سے ان کی خط کتابت کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ علامہ صاحب سے جب ہم نے برطانوی مفکر سے ان کی مراسلت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواباً جو کچھ کہا اسے ہم نے درج ذیل اقتباس کی صورت میں الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

''برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) سے میری کوئی باقاعدہ خط کتابت نہیں رہی۔ ایک زمانے میں جب میں ایک جوان رعنا نخل نو بہار تھا اور وہ ایک سرد و گرم چشیدہ و جہاں دیدہ شجر ثمر بار تھے تو توسیع مطالعہ کے سفر میں ایک روز اچانک ان کی تحریر "Why I am not a Christian" میرے ذوق مطالعہ سے کیا ٹکرائی کہ اس نے میرے بحر ایمان وایقان میں جوار بھاٹا کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ خاص کر ان کی کمان تحریر سے نکلا ہوا ایک تیر دل میں ایسا ترازو ہوا کہ ہائے ہائے..... انہوں نے Logic and mysticism کی دیوار پر یہ نعرہ لکھ دیا۔

''اللہ کے وجود کے بارے میں کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے''

میں نے فوراً انہیں ایک خط لکھا اور استفسار کیا۔

''خدا کے حوالے سے جتنی دلیلیں دی گئی ہیں۔ کیا وہ سب آپ نے پڑھی ہیں؟''

انہوں نے میرے سوال کا کوئی شافی جواب تو نہ دیا۔ البتہ ایک ماہر وکیل کے مانند Cross question کرتے ہوئے لکھا:

''اگر آپ کے پاس کوئی دلیل ہے تو میں Consider کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

ازاں بعد میں نے مختلف کتب میں دیے گئے دلائل کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اور کچھ اپنے فکر و شعور میں زائیدہ شافی و کافی دلائل و براہین بقلم خود رقم کر کے انہیں ارسال کیے، مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا اور یہ سلسلۂ مراسلت آغاز ہی میں انجام کو پہنچ گیا۔

علامہ طالب جوہری نے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اُردو میں بیان کرنے کا اپنا ہی چیلنج قبول کیا..... اور نتیجتاً ''عقلیات معاصر'' منصۂ شہود پر آ گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا علامہ صاحب فلسفہ کو اردو سے اور اردو کو فلسفہ سے مانوس کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔ علامہ صاحب حوضۂ علمیہ نجف سے فارغ التحصیل ہیں۔ جہاں منطق و فلسفہ کے علوم کی ایک خاص معیار تک تعلیم ناگزیر ہے۔ اس درسگاہ میں ذریعہ تعلیم کے لیے عربی زبان مخصوص ہے۔ عربی ایک نہایت زرخیز زبان ہے اور بجا طور پر ام اللسان باور ہوتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یونان کی مخصوص علمی صدی کے بعد ہی دیگر سرزمینیں فلسفہ سے متعارف ہوئیں جن میں عرب کی سرزمین بھی شامل ہے۔ عربی کا فلسفہ کے دقیق مسائل کو سہارنا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ البتہ اُردو کو اس قابل بنانا زبان کا کرشمہ بھی ہے اور علامہ صاحب کا کارنامہ بھی۔

علامہ صاحب نے فلسفہ اور دین پر پہلے الگ الگ اور پھر دونوں پر ایک ساتھ مباحث چھیڑے ہیں۔ ان مباحث میں انہوں نے حسن بیان کے ساتھ ساتھ ترسیل و ابلاغ کے جو ابواب تحیر کھولے ہیں، وہ انہیں ان نابغوں میں شامل کرتے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں قابل رشک ہوتے ہیں۔ ''فلسفہ کیا ہے'' کے عنوان کے تحت علامہ صاحب رقم طراز ہیں:

''ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر فلسفہ کو ایک ایسا فکری اور مجرد علم سمجھا جاتا ہے جس کا انسان کی معاشرتی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل سے کچھ ربط نہیں..... بعض مصنفین فلسفہ کی افادیت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں، یعنی ان کے لاشعور کے کسی کنج میں اس علم کا غیر مفید ہونا مرتکز ہے۔ یہ معذرت خواہانہ رویہ فقط فلسفہ کے ساتھ ہے۔ ورنہ ریاضی، جرثقیل، مباحث ارض اور ہندسہ وغیرہ بھی خشک اور مشکل علوم ہیں لیکن ان کے مصنفین نے کبھی معذرت نہیں کی۔..... فلسفہ کے سلسلے میں اس خوش فہمی یا غلط فہمی کے صحت و سقم پر اس وقت تک بحث نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم لفظ فلسفہ کے معنی نہ سمجھ لیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ لفظ یونانی زبان کے دو لفظوں Philo (محبت) اور Sophia (دانش) سے مرکب ہے جس کا مفہوم علم دوستی یا دانش پسندی ہے۔ اگر علم و حکمت سے محبت کرنے کا نام فلسفہ ہے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ علم و حکمت کیا ہیں اور ان دونوں لفظوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے سے قبل فلسفہ کی افادیت کو ایک اور رُخ سے دیکھتے چلیں۔ مثلاً علم معاشیات کے ذریعے انسان اپنے رزق کے وسائل میں ترتیب و تنظیم قائم کرتا ہے اور کسب رزق کے بہتر مواقع فراہم کر لیتا ہے۔ علم سیاسیات کے ذریعے اپنی روزمرہ کی زندگی کو ایک قانون کے تحت مجتمع کرتا ہے اور اجتماعی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔ علم زراعت کے ذریعے اپنی زمینوں سے بہتر فصل حاصل کرتا ہے۔ سائنسی علوم کے ذریعے اپنی زندگی کو پر آسائش بناتا ہے اور اپنے لیے مختلف قسم کے تحفظات فراہم کر لیتا ہے۔ الغرض یہ سارے علوم اس لیے مفید ہیں کہ انسان ان کے ذریعے انفرادی و اجتماعی زندگی بہتر بناتا ہے۔ یعنی سب علوم انسان کے لیے ہیں،

لیکن انسان کس کے لیے ہے؟ اس کے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ دنیا کا کوئی علم ان سوالات کے جواب نہیں دیتا ہے اور اگر کوئی علم ان کے جوابات دیتا ہے تو وہ جوابات کافی ہوں یا ناکافی..... فقط اور فقط فلسفہ دیتا ہے۔''

فلسفۂ دین کی علامہ صاحب نے کچھ اس طرح تفہیم کرائی ہے۔

''کسی ایسی ذات پر، جو مستحق عبادت سمجھی جائے عقید رکھ کر اس کی عبادت کرنا دین ہے۔ انسان اسی ذات کو قابل عبادت سمجھتا ہے جو اسے فائدہ پہنچا سکے اور اس کی حفاظت کر سکے۔ خواہ وہ ذات کوئی ذی روح وجود ہو یا غیر ذی روح ہو، بھوت پریت ہوں یا کوئی نامفہوم غیر مرئی طاقت ہو..... انسان، کائنات اور لامحدود..... یہ فلسفہ کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ان تینوں کو سمجھنا اور ان میں رشتوں کا تلاش کرنا ہی فلسفہ ہے۔ ان رشتوں کی تفصیل اس طرح ہے کہ انسان کا اپنے نفس سے رشتہ، انسان کا انسان سے رشتہ، انسان کا کائنات سے رشتہ، کائنات کا کائنات سے رشتہ، انسان اور کائنات کا لامحدود سے رشتہ، اب اگر انسان دین کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے صرف ایک جملے میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کا لامحدود کی مشیت کے ساتھ اپنے رشتے کو تلاش کر لینا دین ہے۔''

دین و فلسفہ میں ہم آہنگی و یکجہتی کے عوامل پر علامہ صاحب روشنی ڈالتے ہوئے خامہ فرسا ہیں۔

''فلسفہ کا سرچشمہ عقل ہے۔ جبکہ دین کا ماخذ اہل دین کے نزدیک وحی الٰہی ہے جو عقل کی حاکم ہے اور اسے نیک و بد بتلاتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دین اُوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے اور فلسفہ نیچے سے اُوپر کی طرف جاتا ہے۔ اس جملے میں بلندی و پستی کا استعمال معنوی ہے، مادی نہیں۔ فلسفہ اور دین میں ایک قدر مشترک تو یہ ہے کہ دونوں اسرار کائنات سے پردہ ہٹا کر اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں (خواہ اس خواہش میں دونوں کے مقصود و مطلوب مختلف ہی کیوں نہ ہوں) دونوں ہی کی خواہش ہے کہ وہ اس رشتہ کو دریافت کر لیں جو انسان اور کائنات میں پایا جاتا ہے۔ دین و فلسفہ دونوں کی دلچسپی یہ ہے کہ وہ خدا اور علت العلل یا علت اولیٰ، حیات و موت اور روح و مادہ پر زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔ یہ دونوں کائنات اور اس میں بسنے والے موجودات کے انجام پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کائنات کی مقصدیت پر بات کرنا چاہتے ہیں، دونوں انسان کو ایک ایسی زندگی فراہم کرنا چاہتے ہیں جو راحت، خوشی، عیش و آرام اور نعمت و سعادت سے عبارت ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ وہی چاہتا ہے جو دین چاہتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ دین جذبات، عقل اور عمل تینوں کو مہمیز کرتا ہے اور فلسفہ فقط عقل کو.....''

''عقلیات معاصر'' کے اواخر میں علامہ طالب جوہری نے اثبات وجود خدا اور توحید باری تعالیٰ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اثبات خدا کا پیغام انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ گویا دین و خدا انسان کی فطری ضرورت رہے ہیں۔ بقول ان کے:

''ادیان کی تاریخ نویسوں نے دینی رجحانات کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور روح پرستی، دوسرا دور مظاہر طبیعت کی پوجا، تیسرا دور جادوگری، چوتھا دور بت پرستی، پانچواں دور توحید..... اتنی بات طے ہے کہ انسان کبھی لادین نہیں رہا..... دین رکھنا اور دین پر عمل کرنا اس کی فطرت اوّلیہ میں داخل ہے۔''

اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ صاحب نے واضح کیا کہ پہلے دور میں پتھروں، درختوں اور جانوروں کی پوجا سے انسان نے پہلی مرتبہ جسم سے علیحدہ روح کے مستقبل بالذات وجود کو تسلیم کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ماقبل تاریخ مُردوں کے ساتھ غذائیں رکھنے کا رواج تھا۔ علامہ صاحب نے انسان کے اس عمل سے اثبات وجود خدا کا استدلال کیا ہے۔

''مُردوں کے لیے کھانا رکھنا اپنی ذات میں ایک سادہ ذہنیت کا اظہار سہی، لیکن اس اظہار کے اندرون سے ایک فلسفہ برآمد ہوتا ہے کہ موت، وقت کی نادیدہ خلاؤں میں جست لگا دینے کا نام ہے اور کوئی انسان اپنے ارادے سے یہ سفر اختیار نہیں کرتا۔ لہٰذا کوئی قوت ہے جو اس سفر پر اسے مجبور کرتی ہے اور وہ قوت انسان سے غیر متعلق نہیں ہے۔ چونکہ انسان اس قوت کے آگے مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زندگی کے بہترین نتائج کے لیے اس قوت کو خوش رکھنا اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ یعنی ایک قوت کا وجود ضروری ہے اور اگر ایک سے زیادہ قوتیں ہیں تو ان کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، جو موجود نہیں ہے اور یہی توحید کا پیغام ہے جو انسان کی فطرت میں ڈالا گیا ہے۔''

علامہ صاحب نے منطق و فلسفہ، انسان و کائنات، دین و خدا کے مباحث میں بیسیوں قدیم و جدید فلاسفہ کے افکار و نظریات پیش کیے ہیں۔ بعض کے استدلال سے وہ متاثر ہیں جبکہ بعض کے دلائل کے بارے میں انہیں تحفظات ہیں۔ ''عقلیات معاصر'' میں علامہ صاحب نے جس تبحر علمی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ خال خال دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہم دراصل ان کے نیازمندوں میں شامل ہیں۔ مذہبی امور اور فلسفیانہ مسائل میں ان کے درک کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے خود کو اہل نہیں سمجھتے۔ یہ مضمون ان کی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی نذر ہے۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل - ایک ہمہ جہت عبقری شخصیت

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

غموں اور حادثوں کے موجودہ دور میں ایک حادثہ 14، اپریل 2024ء بروز اتوار وقوع پذیر ہوا جب عظیم منصف اور مصنف، قانون دان، علمی، دینی اور روحانی شخصیت ڈاکٹر جسٹس (ر) منیر احمد مغلؒ اس عالمِ فنا سے عالمِ بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے انوار شعبۂ قانون کے علاوہ درس وتدریس، دینی، علمی اور روحانی شعبوں میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ راقم کا اُن سے تعلق 1973ء سے چلا آ رہا تھا۔ ان کا سانحۂ ارتحال ایک ایسا عظیم قومی وملّی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ان کا وصال جہاں ایک طرف اُن کے اہلِ خانہ کے لیے باعثِ غم ہے، وہاں ہی یہ راقم کے لیے انتہائی صدمے کا باعث ہے۔

جسٹس ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب کے بارے میں مزید اظہارِ خیال سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ان کے علمی کوائف کا ذکر کیا جائے۔ انہوں نے ایل ایل بی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1962ء میں حاصل کی۔ ایم اے اردو 1970ء میں کیا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری، سندھ یونیورسٹی سے 1980ء میں حاصل کی۔ اُن کے ریسرچ پیپر کا عنوان تھا ''تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی۔ سیکشن اسلامی ثقافت''۔ انہوں نے عربی زبان میں بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے 1991ء میں حاصل کی۔

انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور سول جج گھوٹکی 4 مارچ 1966ء سے کیا۔ بعد میں وہ بطور سول جج، ایڈیشنل سیشن جج اور سیشن جج مختلف اضلاع میں فرائض سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے بطور ڈپٹی رجسٹرار ہائیکورٹ 5 جولائی 1973ء سے 9 دسمبر 1979ء تک کام کیا۔ ان کا تقرر بطور جج ہائیکورٹ 10 دسمبر 1996ء کو ہوا۔ جہاں سے وہ 6 جولائی 2001ء کو سبکدوش ہوئے۔ وہ انسدادِ دہشتگردی عدالت کے ایڈمنسٹریٹو جج بھی رہے۔ علاوہ ازیں وہ چیئرمین صوبائی زکوٰۃ کونسل، قانونی مشیر واپڈا، قانونی مشیر نظریہ پاکستان ٹرسٹ اور ممبر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان بھی رہے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور، پاکستان لاء کالج لاہور اور سپیریئر یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں بطور وزیٹنگ پروفیسر بھی اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، پنجاب لاء کالج لاہور، منہاج یونیورسٹی اور یونیورسٹی جنوبی پنجاب کے ممبر بورڈ آف سٹڈیز رہے۔ وہ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی منسلک رہے اور ان اداروں کے اسلامی پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔

مندرجہ بالا خاکہ ہمارے ممدوح ڈاکٹر منیر احمد مغل کی وسیع علمی قابلیت اور لیاقت کا مظہر ہے۔ اس خاکے سے تو ان کی شخصیت کے چند پہلو نمایاں ہوتے ہیں مگر ان کی ہمہ جہت، متحرک، جیتی جاگتی، عقل ودانش، دین ومذہب اور روحانیت کے موتی بکھیرتی ہوئی شخصیت کے رنگ نظر نہیں آتے۔ اُن کے یہ رنگ تو اُن کے عزیز واقارب، حلقۂ احباب میں شامل حضرات، رفقائے کار، طلبا اور مختلف محافل کے سامعین ہی جانتے ہیں جنہوں نے اُن کو ایمانی حرارت، علمی ودینی بصیرت اور روحانی رنگ میں گفتگو یا خطاب کرتے ہوئے سنا ہے۔ ان کے خطاب میں علمیت اور فکر کی گہرائی کے ساتھ بے ساختہ پن، روانی اور تاثیر ہوتی۔ وہ تادیر بے تکان بول سکتے تھے لیکن موقع محل کی مناسبت سے دس پندرہ منٹ میں بھی اپنی گفتگو کو سمیٹ لیتے۔ ان کا آغازِ کلام، اللہ کریم کی حمد وثنا اور رسولِ کریم ﷺ پر درود وسلام سے ہوتا۔ اردو زبان کے علاوہ بعض اوقات وہ پنجابی میں خطاب کر کے سامعین کو دم بخود کر دیتے تھے۔ انہوں نے راقم کے ہاں بھی کئی بار محافلِ میلاد میں خطاب کیا۔ انہیں ایک بار سننے کے بعد سامعین انہیں آئندہ سننے کے لیے مشتاق رہتے تھے۔ وہ انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآنِ پاک کا انگریزی زبان میں ترجمہ وتفسیر لکھی۔ یہ سارا کام انہوں نے کمپیوٹر پر خود ہی ٹائپ کر کے مکمل کیا۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ تمام حروف سات رنگوں میں ٹائپ کیے گئے۔ یہ عظیم دینی کام ہمارے ممدوح کی حیاتِ ظاہری میں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اُمید ہے کہ ترجمہ وتفسیر کی طباعت واشاعت کا فریضہ ان کے فرزندانِ گرامی سرانجام دیں گے۔

ڈاکٹر منیر احمد مغل نے مختلف موضوعات پر انگریزی زبان میں کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کیں، تراجم کیے اور مضامین لکھے۔ ان کے مضامین کی تعداد تقریباً 257 ہے جو ملکی اور غیر ملکی جرائد میں چھپے۔ انہوں نے بعض اہم اور دقیق دینی کتب کے انگریزی زبان میں تراجم کیے جن میں آداب القاضی (4 جلدیں)، عین الفقر، فصوص الحکم، دیوانِ شمس تبریز اور مکتوبات امام ربانی شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب تقریباً 1228 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان جملہ کتب کو اردو زبان میں سمجھنا بھی دشوار ہے۔ ان کی

تفہیم قابل اساتذہ کی مدد سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مغل صاحب نے ان کتابوں کے انگریزی زبان میں تراجم کر کے حیران کن کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ بھی لکھوا رہے تھے لیکن ان کی بیماری کے باعث یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ تصوّف اور اسلامی موضوعات پر کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے کثیر تعداد میں قانونی کتب بھی تحریر فرمائیں۔ ڈاکٹر مغل صاحب نے تصنیف وتحریر کا جو عظیم الشان کام کیا ہے، وہ دراصل ایک بڑے ادارے کا کام ہے۔ اسے سامنے رکھ کے بندہ حیرت واستعجاب کے عالَم میں کھو جاتا ہے کہ ڈاکٹر مغل صاحب نے کیسے اتنا مشکل اور وسیع کام تنہا سرانجام دیا۔

ہمارے ممدوح شب وروز تصنیف تالیف کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اس کام کے دوران جب کبھی انہیں کچھ فرصت ملتی تو وہ بسم اللہ شریف، کلمہ طیبہ اور درود شریف اپنی نوٹ بکس میں لکھتے رہتے۔ ان کی ایسی کم وبیش 400 نوٹ بکس ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ خوش مزاجی سے کہتے کہ میں نے اپنے نیکیاں لکھنے والے فرشتے کو آرام دینے کے لیے یہ کلماتِ خیر لکھنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ بیماری کے دوران جب لکھنا ممکن نہ رہا تو وہ دل میں ہی ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔

ڈاکٹر مغل صاحب صحیح اسلامی اور روحانی رنگ میں رنگے ہوئے درویش تھے۔ بعض اوقات وہ اپنا تعارف یوں کرواتے کہ ''میں تو داتا درباری ہوں''۔ اسی طرح اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ آپ کا مسلک کیا ہے؟ تو جواباً یہی ارشاد فرماتے کہ ''میں داتا درباری ہوں''۔ ان کی یہ سوچ کہ وہ داتا درباری ہیں کو یوں شرفِ قبولیت حاصل ہوا کہ 2004ء میں انہیں داتا دربار کے چیئرمین RPC (کمیٹی مذہبی اُمور)، لگا دیا گیا۔ اس حیثیت میں انہوں نے دلی عقیدت، دیانت داری اور عجز وانکساری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ کئی بار وہ اصرار کر کے صحنِ داتا دربار میں جاروب کشی فرماتے۔ انہیں دیکھ کر دربار کے عملے کے افراد میں بھی کام کرنے کا جذبہ فزوں تر ہو جاتا۔ وہ اپنے اس کام کو فخریہ انداز سے احباب میں بیان فرماتے۔ اس عجز وانکساری سے ان کی شخصیت کو جو رفعت نصیب ہوئی، وہ اُن افسران کے تصوّر سے بعید ہے جو پروٹوکول کی پابندیوں میں رہ کر اپنی مصنوعی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں۔

اللہ کریم نے قرآنِ پاک میں اولیاء اللہ کے جس مقدّس گروہ کا ذکر فرمایا ہے، جسٹس ڈاکٹر مغل ان کا دل وجان سے احترام کرتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۲) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ''۔ ترجمہ: یاد رکھو بے شک جو اللہ کے ولی ہیں انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ یا پرہیزگاری کو اپنایا (سورۂ یونس: آیات ۶۲، ۶۳)۔ انہوں نے کئی صالحین اور اولیائے کرام سے اکتسابِ فیض کیا لیکن ان پر سب سے زیادہ کرم نوازی حضرت صوفی برکت علی اور ان کے خلیفہ صمد خان صاحب نے فرمائی۔ ایک بار جب وہ ڈپٹی رجسٹرار ہائیکورٹ تھے تو وہ چند جج صاحبان (جسٹس سردار محمد اقبال صاحب، جسٹس شمیم حسین قادری، جسٹس محمد رفیق تاڑر، جسٹس ایم اے ظلّہ، جسٹس محمد صدیق) کے ہمراہ حضرت صوفی برکت علی صاحب کی زیارت کے لیے ان کے مرکز سالار والا فیصل آباد میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات میں ہی حضرت صوفی صاحب نے ڈاکٹر مغل صاحب کو فیض یاب فرما دیا۔ دارالاحسان میں کتابیں دیکھنے کے دوران صوفی برکت علی صاحب کی انتہائی قیمتی اور ضخیم کتاب ''ترتیب شریف'' کو دیکھ کر ڈاکٹر مغل صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ کتنا اچھا ہو کہ صوفی صاحب یہ کتاب انہیں دے دیں۔ ان کے دل کی بات کو روشن ضمیر ولی اللہ نے فوراً بھانپ لیا اور فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، یہ کتاب تم لے لو۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی انتہائی قیمتی کتابوں سے ان کی گاڑی کو بھر دیا۔ انہوں نے اسی وقت ارشاد فرما دیا کہ منیر مغل ہائیکورٹ کا جج ہو گیا ہے۔ حضرت صوفی صاحب کا یہ ارشاد حقیقت بن کر 1996ء میں سامنے آیا۔

ذرا غور کریں کہ اتنی اعلیٰ تعلیم اور بے شمار مناصب حاصل کرنے والے ہمارے ممدوح ڈاکٹر منیر احمد مغل میں بڑائی، تکبّر اور رعونت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ان کی متبسّم اور دل آویز شخصیت کے نمایاں پہلو، ملنساری، انکساری، عاجزی اور خوش اخلاقی تھے۔ یہی پہلو، ان کے صاحبِ ایمان ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نفس کو مطیع کرنے کے لیے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر چلّہ کشی تو نہ کی لیکن عام زندگی میں عجز وانکساری کے حیران کن کام کیے۔ وہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے تو نمازیوں کے جوتے سلیقے اور ترتیب سے لگا دیتے تاکہ نمازی باہر نکلتے وقت بآسانی جوتے پہن لیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے سے ان کی زندگی کے کام سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ایک بار پروفیسر سیّد محمد اکرام صاحب کے ہاں محفلِ میلاد کے موقع پر کسی صاحب نے ڈاکٹر مغل صاحب کی تعریف شروع کر دی تو انہوں نے یکدم

پروفیسر صاحب کے جوتے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیے اور کہا کہ میں تو ان کے جوتوں کے برابر بھی نہیں ہوں۔انہوں نے اپنے نفس میں تکبّر اور بڑائی کے احساسات اُبھرنے سے پہلے پل بھر میں ان کا خاتمہ کر دیا۔وہ اپنی عاجزی کا اظہار کرنے کے لیے اکثر نجی محافل اور پبلک اجتماعات میں حضرت میاں محمد بخشؒ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:۔

خس خس جتاں قدر نہ میرا، میرے صاحب نُوں وڈیائیاں
میں گلیاں دا رُوڑا کوڑا تے محل چڑھایا سائیاں

اُن کا یہ شعر پڑھنا محض زبانی کلامی خوش وقتی کے لیے نہیں تھا بلکہ اُن کے خون میں رچی بسی عجز وانکساری کی حقیقت کا اظہار تھا۔انہوں نے اپنی ساری عمر عاجزی کے رنگ میں گزاری ۔اُن کی عاجزی کے حوالے سے ایک واقعہ پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر وائرل ہوا۔ان کے والد محترم ہسپتال میں داخل تھے،اسی کمرے میں ایک پولیس آفیسر کے والد کا بھی بیڈ موجود تھا۔ایک رات انہیں بہت شدید کھانسی اور قے وغیرہ ہوتی رہی ۔ساری رات اُن کی دیکھ بھال ڈاکٹر مغل کرتے رہے۔صبح کے وقت پولیس آفیسر ہسپتال پہنچے تو ان کے والد نے بتایا کہ آج ساری رات یہ صاحب میری خدمت کرتے رہے۔پولیس آفیسر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی بہت مہربانی اور ان کو پانچ سو روپے کا نوٹ دینے کی بہ تکرار کوشش کی ۔ڈاکٹر صاحب نے رقم لینے سے سختی سے انکار کیا جس پر پولیس آفیسر حیران رہ گیا اور پوچھنے لگا کہ مولوی صاحب آپ کام کیا کرتے ہیں؟ کئی بار پوچھنے پر جب مغل صاحب نے بتایا کہ وہ ہائیکورٹ کے جج ہیں تو پولیس آفیسر سخت شرمندہ ہو کر معافی کا طلبگار ہوا۔

مغل صاحب نے مسکرا کر اُسے معاف کر دیا۔عاجزی وانکساری کی خوبی اولیائے کرام کا خاصہ ہے اور بلاشبہ ہمارے ممدوح ایک صاحب مقام ولی اللہ تھے۔ان کی عاجزی کا رنگ اپنے والد محترم حاجی محمد رمضان صاحب کی خدمت بجا لاتے ہوئے اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا۔وہ ان کے ہر اشارے اور ارشاد پر فی الفور عمل کرتے۔حاجی صاحب موصوف آخری عمر میں کئی برس تک بیمار رہے۔ان کے عزیز واحباب ان کی عیادت کے لیے آتے تو وہ ہر آنے والے کو باداموں کا تحفہ پیش کرتے۔اُس دور میں ڈاکٹر مغل صاحب سیشن جج تھے،وہ اپنی محدود تنخواہ میں گزر اوقات کرتے۔ان کے والد محترم ان کو حکم دیتے تو وہ باداموں کا ایک پورا بیگ خرید کر ان کے قریب رکھ دیتے۔جب بادام ختم ہونے کے قریب ہوتے تو والد محترم انہیں پھر حکم دیتے کہ مزید بادام خرید کر لاؤ۔ایک بار ایسا بھی ہوا کہ یہ فریضہ سرانجام دیتے دیتے ڈاکٹر صاحب کی کل پونجی صرف ہو گئی حتیٰ کہ ان کی اہلیہ محترمہ کے زیورات بھی بک گئے لیکن انہوں نے اپنے والد محترم کے حکم سے سرتابی نہ کی۔بیماری کے دوران ڈاکٹر مغل صاحب اپنے والد محترم کی جسمانی صفائی ستھرائی کا اہتمام بھی خود کیا کرتے تھے،اس دوران انہیں ان کے والد محترم کی دلی دعائیں حاصل ہوئیں ۔اسی دوران ایک روز اچانک یہ خوشخبری سامنے آئی کہ ڈاکٹر مغل کو لاہور ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ اعزاز حضرت صوفی برکت علی صاحب اور میرے والد محترم کی دعاؤں کے طفیل حاصل ہوا۔

ڈاکٹر مغل صاحب ایک مستجاب الدعا درویش اور ولی اللہ تھے۔ان کی دعاؤں سے کثیر تعداد میں لوگ فیض یاب ہوئے۔ان سے جب بھی کوئی شخص دعا کی درخواست کرتا،وہ فی الفور بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کر دیتے اور اللہ تعالیٰ سائل پر کرم فرما دیتا۔اس ضمن میں کئی واقعات کا راقم کو علم ہے لیکن ان کو بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ڈاکٹر مغل صاحب مستجاب الدعا ہونے کے ساتھ صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔پروفیسر مظفر حسین صاحب نے راقم کو بتایا کہ ان کی شادی کے بعد کئی برس گزر گئے مگر انہیں اولاد کی نعمت عطا نہ ہوئی۔انہوں نے ایک موقع پر اس بات کا ذکر ڈاکٹر مغل صاحب سے کیا۔انہوں نے پہلے تو ہاتھ اُٹھا کر مظفر صاحب کی اولاد کے لیے اللہ کے حضور التجا اور دعا کی اور پھر فرمایا کہ ایک سال بعد میں جب تمہارے گھر آؤں گا تو تمہارے ہاں ایک فرزند محمد عبدالرحمٰن نافع نام کا ہوگا۔پھر اللہ تعالیٰ تمہیں دو اور بیٹے عطا فرمائے گا اور بعد ازاں اللہ تعالیٰ تمہیں ایک بہت پیاری بیٹی عطا فرمائے گا۔اللہ کریم نے ان کے لفظوں کی لاج رکھی اور مظفر صاحب کو تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا ہوئی۔پہلے بیٹے کا وہی نام رکھا گیا جو ڈاکٹر مغل صاحب نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔

جسٹس مغل صاحب نے راقم کو ایک بار یہ واقعہ سنایا کہ وہ بطور سیشن جج مقدمات سن رہے تھے تو اچانک عدالت کے باہر کچھ شور شرابا ہوا اور ایک شخص چیختا چلاتا بھاگ کر عدالت میں داخل ہوا۔اس نے دہائی دی کہ ''جج صاحب مجھے بچالیں''۔اس کے پیچھے پیچھے کئی افراد اور پولیس کانسٹیبل بھاگتے ہوئے اندر آئے ۔جج صاحب نے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو بعد میں آنے والے افراد نے کہا کہ پہلے جو شخص بھاگ کر عدالت میں داخل ہوا ہے، اس نے اُن کی رقمیں ادا کرنی ہیں اور انہوں نے اس کے

خلاف سول کورٹ سے ڈگریاں حاصل کی ہیں جن کے اجرا کی عدالتی کارروائی ہو رہی ہے ۔ یہ شخص عدالت میں پیش نہیں ہوتا جس پر اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے ہیں۔ڈاکٹر مغل صاحب نے پہلے آنے والے شخص سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اس شہر کا سب سے بڑا سُنار تھا،اس نے بہت سے لوگوں کو قرض پہ رقمیں دیں، جنہوں نے وہ رقمیں واپس نہ کیں، اس کے مالی حالات خراب ہوئے، کاروبار بند ہوگیا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان حالات میں وہ قرض خواہوں کو رقم کہاں سے دے؟ یہ سن کر جج صاحب (ڈاکٹر مغل صاحب) نے قرض خواہوں سے پوچھا کہ کیا وہ قسطوں پر رقم وصول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ تو سب نے ہاں میں جواب دیا۔ اس پر جج صاحب نے اپنی قیمتی گھڑی نکال کر میز پر رکھی۔ بنک میں موجود اپنی رقم میں سے اپنے بیوی بچوں کے لیے ایک ماہ کا خرچ رکھ کر باقی رقم کا چیک تیار کیا اور فرمایا کہ آج ہی گھڑی بیچ کر اور بنک کی رقم قرض خواہوں کو بطور پہلی قسط کے ادا کی جائے گی ۔بقایا ماہانہ قسطوں کے لیے وہ کچھ اہلِ ثروت سے فنڈ حاصل کریں گے اور اپنا حصہ بھی ڈالتے رہیں گے ۔اس ساری کارروائی کے دوران قرض خواہوں کے جذبات میں عجب کیفیات پیدا ہوتی رہیں ۔ان میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا کہ وہ مقروض کا حقیقی بھائی ہے ۔وہ جج صاحب کے ایثار و قربانی سے متاثر ہو کر اپنی رقم کے تقاضے سے دستبردار ہوتا ہے اور مقروض کو معاف کرتا ہے۔ یہ سن کر باقی سب نے بھی اپنے اپنے حصے کی رقم معاف کر دی۔فریقین عدالت میں خوش دلی سے گلے ملے۔عدالت میں ہی ایک تحریر تیار کی گئی جس میں سب قرض خواہ اپنی رقم کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے ۔ یہ دستاویز متعلقہ سول کورٹ میں پیش کی گئی تو رقم کی وصولی کے لیے اجرا ڈگری کی کارروائی ختم کر دی گئی۔اس سارے واقعہ پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مغل صاحب کی نیک نیتی ،خلوص اور روحانی قوت سے اس کرامت کا ظہور ہوا کہ غصے اور دشمنی کے جذبات سے بھرے ہوئے قرض خواہوں کے دل یکدم بدل گئے ، ان میں ہمدردی ، ایثار و قربانی اور عفو و درگزر کے جذبات بھر گئے اور انہوں نے مقروض کو خوش دلی سے معاف کر دیا۔اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات ہیں لیکن فی الحال ان سے صرفِ نظر کر کے آخر میں، میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مغل صاحب ایک صاحبِ مقام اور صاحبِ کرامت ولی اللہ تھے۔اللہ کریم نے انہیں ایمان کی حرارت اور افکار کی نورانیت سے نوازا تھا جس سے وہ ہر خاص و عام کے قلوب کو منور کرتے رہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ بزبانِ شعر یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے:

بکھیرتے رہے ہر سُو جو نور ممکن تھا
مثالِ شمع رہے شعلہ بار ہم بھی ہیں

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر منیر احمد مغل کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات عطا فرمائے،ان کے مرقد پر ابدالآباد تک اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ ،عزیز و اقارب اور احباب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین۔

کہنے کو وہ رُخصت ہوئے دنیا سے بظاہر
یادوں میں ہماری وہ سدا زندہ رہیں گے

❀❀❀

نعت

جہاں میں دین حق کا بول بالا کر دیا تم نے
مرے آقا! اندھیرے میں اُجالا کر دیا تم نے
جبین آدمیت پر حرا کا نور جب چمکا
عرب کے چاند! دنیا بھر پہ ہالہ کر دیا تم نے
کوئی بس طور تک، تم شمعِ بزم لامکانی تک
وقار آدمیت کتنا بالا کر دیا تم نے
گرے لات و منات ظاہری و باطنی سارے
کہ خالی غیر سے دل کا شوالہ کر دیا تم نے
بجھے شعلے شقاوت کے، پڑی جب پیار کی شبنم
عمر کی آتش نفرت کو پالا کر دیا تم نے
عرب یعنی گذر یے دشت کے، صحرا کے رکھوالے
شتر بانوں کو بھی تہذیب والا کر دیا تم نے
مٹایا قیصر و کسریٰ کا استبداد دنیا سے
شکوہ کفر کو مکڑی کا جالا کر دیا تم نے
تمہاری ذات سے ممکن ہوئی قسمت کی تابانی
مقدر اپنے بزمی کا نرالا کر دیا تم نے

سرفراز بزمی/راجستھان انڈیا

یہ روز و شب کی صداقت فریب سی کیوں ہے
میں جی رہا ہوں تو احساسِ خودکشی کیوں ہے
ترے لیے تو ہر اک سے بچھڑ گئے اے دوست
بہ ایں ہمہ ترا لہجہ شکایتی کیوں ہے
ہر ایک سمت اُجالا ہے لوگ کہتے ہیں
تو پھر یہ آنکھوں میں اس درجہ تیرگی کیوں ہے
ترے قریب بھی آ کر ترا ہر اک انداز
میں سوچتا ہوں کہ اتنا روایتی کیوں ہے
مری نمو بھی اسی سے مرا وجود بھی یہ
یہ سرزمین مگر پھر بھی اجنبی کیوں ہے
جو طے کیا تھا نہ سوچیں گے اب کبھی آذر
تو پھر رگوں میں مری زہر آگہی کیوں ہے

ڈاکٹر شمیم آذر/امریکہ

اُردو اور آرمینی زبان کے روابط (جغرافیائی اور سیاسی پس منظر)

خاور اعجاز

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں اور کردوں کی شکل میں اسلامی قوتوں کی آرمینیائی علاقوں میں آمد شروع ہُوئی۔عبدالرحمان بن ربیعہ کی قیادت میں ۶۳۹ء میں عرب مسلمانوں کی فوج نے آرمینیا پر حملہ کیا۔شہزادہ تھیوڈورس رشتونی (Prince Theodoros Rshtuni) نے دفاع کی ناکام کوشش کی تاہم ۶۵۲ء میں دمشق میں شہزادے کے ساتھ ایک معاہدے کی رُو سے اُسے آرمینیا، جارجیا اور کاکیشین البانیہ کا حکمران تسلیم کرتے ہُوئے مذہبی آزادی دی گئی۔ساتویں صدی ہی کے اواخر میں خلیفہ کے خصوصی نمائندے، جنھیں اوستیکان (گورنر) کہا جاتا تھا، آرمینیا پر حکومت کی غرض سے بھیجے گئے اور آٹھویں صدی کے آغاز میں حجاز اور دوسرے علاقوں کے عرب قبائل نے آرمینیا کے بڑے شہروں میں آباد ہونا شروع کیا۔۱۰۷۱ء میں بازنطینیوں کی شکست کے بعد وسطی ایشیا اور شمالی ایران سے آنے والے ترک خانہ بدوش آہستہ آہستہ آرمینیا کے طول وعرض میں پھیل گئے اور مسلم امیروں نے آرمینی خواتین سے شادیاں کر لیں۔اسی اثنا میں واسپورکان (VAspurakan) کے بادشاہ، آرمینی شہزادہ طہارتن (Taharten) کے بیٹے، ایرزنجان (Erzinjan) کے گورنر اور اس کے بیٹے کے علاوہ شاہ ٹریبیزنڈ (Trebizond) کی بیٹی نے اسلام قبول کیا۔گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں ایک جانب سلجوقی ترک عناصر اور دوسری جانب صفوی، افشاری، زند اور قاچار خاندانوں کا اثر ورسوخ بڑھا جس کی وجہ سے آرمینیا کے لوگوں کو مجبوراً اسلام قبول کرنا پڑا کیونکہ بصورتِ دیگر وہ سزائے موت کے مستحق سمجھے گئے۔پندرھویں صدی عیسوی میں آرمینیائی علاقوں میں عثمانی اور صفوی مہم جوئی نے بہت سے آرمینیوں کو مذکورہ سلطنتوں کا حصہ بن جانے پر مجبور کیا۔قفقاز اور مشرقی آرمینیا پر قبضہ کے بعد ایران کے شاہ عباس نے قریباً چالیس ہزار افراد کو، جن میں زیادہ تر تاجر تھے، اصفہان اور زلفہ میں منتقل کیا۔

آرمینی تاریخ دان زینوب (Zenob Glak) کے مطابق اجین کے دو ہندو شہزادوں نے آرمینیا میں پناہ لی تھی جن کی اولادوں نے وہاں کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی اور اُن کے بسائے ہُوئے ہندو شہر ۳۰۱ء میں آرمینیا میں عیسائیت کے طلوع ہونے تک ترقی پذیر رہے۔دوسری طرف تھامس کانا (Thomas Cana) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا آرمینیائی باشندہ تھا جو ۷۸۰ء کے اِرد گرد مالابار کے ساحل پر اُترا۔روایات کے مطابق کانا کے ساتھ ۷۲ خاندانوں پر مشتمل پادریوں کا ایک گروہ مالابار کے ساحلی شہر کوڈنگلور (ضلع تھریسور، کیرالہ) آیا جہاں چیرا خاندان کی جانب سے اُنھیں سماجی اور اقتصادی مراعات حاصل ہُوئیں۔کانا کی آمد شامی عیسائیوں کی تاریخی ہجرت کو ظاہر کرتی ہے۔ آرمینیوں کی برِصغیر میں آمد فارس، باختر (افغانستان) اور تبت کے زمینی راستوں سے بھی اہم تجارتی مراکز تک رہی۔اولین آرمینی تاجروں نے یہاں بستیاں نہیں بسائیں بلکہ آتے جاتے مصالحہ جات اور ململ کی تجارت کرتے رہے، جس کے لیے برِصغیر کی شہرت تھی۔

جب فارس اور اناطولیہ میں شہنشاہ اکبر کی دعوت اور مذہبی آزادی کی ضمانت کی خبریں پھیلیں تو آرمینیوں کی بڑی تعداد برِصغیر کی جانب متوجہ ہُوئی جن میں بہت سوں نے خاندانوں سمیت آگرہ اور کچھ نے گجرات کی بندرگاہ کا انتخاب کیا۔مؤرخین کے مطابق آرمینیوں نے ۱۴ویں صدی عیسوی کے اوئل میں سورت میں آباد ہونا شروع کیا۔برِصغیر میں ولندیزیوں اور انگریزوں سے قبل مغل سلطنت کے دوران چند آرمینی شمالی ہندوستان میں مغل حکمرانوں تک بھی پہنچے جیسا کہ عبدالحئ صاحب جو شہنشاہ اکبر کے عہد میں منصبِ اعلیٰ کے مرتبہ پر فائز رہے۔اکبر ہی کے عہد میں آرمینی باشندوں کو آگرہ میں آباد ہونے میں سہولتیں دی گئیں جن میں اُن کو تجارتی سامان کی نقل وحمل پر ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔پھر اورنگزیب نے مرشد آباد کے مضافات میں سید آباد کے مقام پر آرمینی باشندوں کو بستی بسانے کی اجازت دی۔اِنھی میں سے اکثر لوگوں نے ہندوستان میں مختلف نوابوں کے لیے فوجی اور دیگر سماجی خدمات انجام دیں۔ بعض آرمینی دلّی کے علاوہ آگرہ، بمبئی، چنسورہ، چندر نگر، ڈھاکہ، سورت، سید آباد، کانپور، کلکتہ، گوالیار، لاہور، لکھنو، اور مرشد آباد کے علاوہ کابل اور برما نیز دیگر جنوب مشرقی علاقوں تک بھی پھیلے اور اِن خطوں میں تاجروں، پادریوں اور کرائے کے سپاہیوں کے طور پر کام کرتے رہے۔اِس طرح آہستہ آہستہ آرمینی برِصغیر میں دولت مند ہوتے گئے اور اُنھوں نے یہاں کے مختلف شہروں میں بستیاں قائم کرنا شروع کیں اور ۱۵۶۲ء میں آگرہ، ۱۷۳۴ء میں کلکتہ، ۱۷۵۸ء میں سید آباد، ۱۷۷۸ء میں سورت اور ۱۷۷۲ء میں چنائے میں گرجا گھر بنائے، اخبارات جاری کیے، حتیٰ کہ ۱۷۷۳ء میں پہلا آرمینی دستور بھی یہیں مرتب ہُوا اور آرمینی ایک اہم تجارتی برادری کے طور پر اُبھرنے لگے۔

مشہور آرمینی شخصیات

فرقد سباخی (Farqad Sabakhi) متوفی

۷۲۹ء آرمینی مسلمان مبلغ اور خواجہ حسن بصری کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اِس اعتبار سے وہ تابعین کی صف میں آتے ہیں۔ وہ دراصل عیسائی تھے اور یہودی عیسائی صحائف کا علم رکھتے تھے۔ مشہور صوفی معروف کرخی کی تربیت اُنھوں نے ہی کی تھی۔ علی بن یحییٰ الارمانی ۸۴۰ء میں مصر کے گورنر بنے۔ وہ بطور کماندار ۸۵۲ء تا ۸۶۲ء بازنطینیوں کے خلاف نبرد آزما رہے اور ۸۶۲ء میں اپنے آبائی وطن آرمینیا کے گورنر ہُوئے لیکن اگلے ہی برس بازنطینیوں کے ساتھ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ابو النجم بدر (۱۰۰۵ء۔۱۰۹۴ء) آرمینی تھے اور بدر الجمالی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ خلیفہ المستنصر کے ماتحت فاطمی خلافت کے ممتاز سیاستدان اور وزیر رہے اور آرمینی باشندوں کی مصر میں ہجرت کو فروغ دیا۔ الافضل شہنشاہ (۱۰۶۶ء۔۱۱۲۱ء) بدر الجمالی کے فرزند تھے اور اُن کے بعد مصر کے وزیر بنے۔ ڈومنگو پائرس (Domingo Pires) ایک آرمینی عیسائی تھے جو دربارِ اکبری میں ماہرِ لسانیات اور پرتگالی زبان کے مترجم کے طور پر تعینات رہے کیونکہ اُس عہد میں پرتگالی واحد یورپی زبان تھی جو برِصغیر میں متعارف تھی۔ اکبر نے اُنھیں سفارتی ترجمان کی حیثیت سے ۱۵۷۹ء میں گوا بھیجا تھا۔ محققین کی نظر میں 'ڈومنگو' یا 'پائرس' آرمینی نہیں پرتگالی نام ہیں جو اُنھوں نے غالباً گوا یا میلاپور کے قیام کے دوران اختیار کیے ہوں گے۔ ڈومنگو نے ۱۵۸۲ء میں ایک دیسی خاتون سے شادی کی۔ قرچغائے خان (Qarachaqay Khan) متوفی ۱۶۲۵ء آرمینی نژاد تھے۔ وہ صفوی شاہ عباس اول کے وفادار کمانڈر تھے اور جارجیا کے باغیوں کی سرکوبی کرتے ہُوئے کام آئے۔ محمد بیگ (متوفی ۱۶۷۲ء) بھی آرمینی نژاد مسلمان تھے جنھوں نے ۱۶۵۴ء تا ۱۶۶۱ء صفوی بادشاہ عباس دوم کے دور میں بطور وزیرِ اعظم خدمات انجام دیں۔ کھوجہ مارٹیروز (Khoja Martyrose) ایک مالدار آرمینی تاجر تھے۔ آگرہ کے آرمینی قبرستان میں اُن کا مقبرہ موجود ہے جو ۱۶۱۱ء میں اُنھوں نے اپنے لیے خود تعمیر کرایا۔ کھوجہ فانوس قلندر (Khoja Phanoos Kalandar) اولین معروف آرمینی ہیں جنھوں نے ۱۶۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ انگریزی بحری جہازوں کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا معاہدہ کیا۔ کھوجہ اسرائیل سرحد (Khoja Israel Sarhad) کھوجہ فانوس کے بھتیجے اور فرخ سیر کے دربار میں کمپنی کے وکیل تھے۔ اُنھوں نے صوبیدارِ عظیم الشان سے کمپنی کے لیے کلکتہ میں غیر معمولی مراعات کے ساتھ زمینداری حاصل کرنے میں انگریزوں کی مدد کی۔ کھوجہ مارگر (Khoja Margar Avag Sheenentz) کے بیٹے کھوجہ جوہانس (Khoja Jahannes) نے ۱۶۹۵ میں چنسورہ میں ایک چرچ کی بنیاد رکھی جو ۱۶۹۷ میں مکمل ہُوا اور اِسی برس جوہانس نے وفات پائی اور اُن کا جسدِ خاکی اپنے بنائے ہُوئے چرچ کے اندر دفن کیا گیا۔ کھوجہ پیٹرس نکولس (Khoja Petrus Nicholas) نواب علی وردی خان کے عدالتی مشیر اور سرمایہ گذار تھے اور سید آباد کے سب سے نامور تاجر خیال کیجاتے تھے۔ نواب موصوف کی اہلیہ اُنھیں اپنا بھائی تصور کرتی تھیں اور اُن سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اُنھوں نے ۱۷۶۷ء میں وفات پائی اور سید آباد کے آرمینی چرچ یارڈ میں مدفون ہُوئے۔ سید آباد میں اُن کے بعد مشہور ہونے والے تاجر کھوجہ پیٹرس ارتھون (Khojah Petrus Arathoon) تھے۔ ارتھون کے بیٹے آیاتھون پیٹرس نے ۱۸۲۰ء میں سید آباد میں ایک خیرات گھر کھولا جہاں سے ہزروں آرمینی مستفید ہُوئے۔ کھوجہ واجد نے، جو ایک بااثر آرمینی تاجر کھوجہ مہمت فاضل کے بیٹے تھے، اٹھارویں صدی کی پانچویں دہائی میں برِصغیر کی تجارتی اور سیاسی زندگی میں خاصا نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ۱۷۵۳ء سے یورپی کمپنیوں کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے کمپنی اور نواب سراج الدولہ کے درمیان مذاکرات کی فضا بھی بنائی۔ پلاسی کی جنگ کے بعد نواب میر جعفر سے پٹنہ میں نمک کی نکلی تجارت کا پروانہ حاصل کیا لیکن ۱۷۵۸ء میں کمپنی نے اُن کے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور اگلے برس جیل میں ڈال دیا جہاں اُنھوں نے زہر کھا لیا۔ کھوجہ گریگوری اراتھون (Khoja Gregory Arathoon) گورگن خان کے نام سے مشہور تھے۔ وہ کھوجہ پیٹرس کے بھائی اور نواب میر قاسم کے وزیر ہونے کے ساتھ فوج کے کماندار بھی تھے۔ اگست ۱۷۶۳ء کے لگ بھگ قتل کر دیے گئے۔ اُن کے دوسرے بھائی کھوجہ بارسک اراتھون (Khoja Barsich Arathoon) تھے جو کہ سید آباد کے جانے پہچانے تاجر تھے مگر گورنر ہیری ویرلسٹ (Harry Verelst) کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر ۱۷۶۹ء میں انتقال کر گئے۔ اسی طرح دو اور معروف تاجر گریگور کھوجامل (Gregore Khojamall) اور جوہانس رافیل (Johanness Rafael) بھی گورنر ویرلسٹ سے اختلافات کے نتیجے میں قید کیے گئے۔ ہرپسیما (Hripsimah Leembruggen) سورت کی ایک مشہور خاتون تاجر تھیں جو ایک آرمینی تاجر ایلیزر ووسکان (Eleazar Woskan) کے ہاں ۱۷۷۸ء میں پیدا ہُوئیں اور ۱۸۳۳ء کو نیگاپٹم میں وفات پائی۔ اُن کی وصیت کے مطابق اُن کے ۱۸۶۶۰ روپے کا ترکہ آرمینیائی اکادمی کو دیا گیا جو آجکل آرمینیائی کالج کلکتہ کہلاتا ہے۔ شاہ نذر خان (م ۱۷۸۴ء) نے احمد شاہ درانی کے لیے اٹھارھویں صدی کے وسط میں زمزمہ توپ بنائی جسے درانی نے ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی جنگ میں استعمال

کیا۔شاہ نذر قیقولی(Qaiquli) کے اعلیٰ وردی(Allaverdi) کے فرزند تھے۔کیچک اراکیل(Catchick Arrakiel)اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں کلکتہ کی آرمینی کمیونٹی کے ایک بااثر فرد تھے اور اولین درجہ کے نامور سوداگروں میں شمار ہوتے تھے۔اُن کا انتقال جولائی ۱۷۹۰ء میں ہُوا۔عبدالمسیی مارٹیروز(Abdul Massy Martyrose) کلکتہ کی ایک معروف شخصیت تھے جو اپنی حب الوطنی اور انسان دوستی کے لیے مشہور تھے۔وہ میسی بابا جان کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی جمع پونجی خیراتی اور ادبی اداروں کے لیے وقف کی۔اُن کی قبر پر لگے کتبے پر اُن کی تاریخ وفات درج نہیں لہٰذا کچھ نہیں کہا جا سکاتا کہ وہ کب فوت ہُوئے۔اراتون اپکار(Arratoon Apcar)۱۷۷۹ء میں پیدا ہونے والے کلکتہ کے ایک اور مالدار تاجر تھے۔اُنھوں نے سولہ برس کی عمر میں بمبئی میں ایک آرمینی تاجت اسکندر کے ساتھ تجارتی کام شروع کیا پھر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ آئے جہاں ۸۵ برس کی عمر میں ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔نکولس پوگوز(Nicholas Pogose) نکی پوگوز کے نام سے جانے جاتے تھے۔زمینداری اور تجارت کے معاملات میں تجربہ رکھتے تھے اور ڈھاکہ بینک کے شراکت دار ہونے کے ساتھ ڈھاکہ میونسپلٹی کے کمشنروں میں سے ایک تھے۔گریگوری چارلس پال ۱۸۳۱ء میں کلکتہ میں پیدا ہونے والے ایک آرمینی تھے جو برطانوی دورِحکومت میں تیس برس سے زائد ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر متمکن رہے۔اُنھوں نے ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔آرمینی قبرستان آگرہ کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کبھی آرمینیوں کا ایک ہنستا بستا شہر آباد تھا جیسے:

(۱) آغامراد ولد لیون آف بٹلس (Leon of Bitlis)متوفی ۱۶۱۱ء۔

(۲)بخشوم ولد ستور(Satoor) متوفی ۱۶۱۳ء۔

(۳)ذکریا ولد امیر خان متوفی ۱۶۱۳ء۔

(۴)استوتزاطور (Astwatzazatoor) ولد تصالح (Thsaleh) متوفی ۱۶۱۴ء۔(۵)ایگاتھ(Egath) ولد اتیر استھ(Atir Asath)متوفی ۱۶۱۵ء سے لے کر کیچک(Catchick) ولد اراکیل (Arakiel) متوفی ۱۷۰۷ء تک کوئی ۵۶ افراد کے نام آتے ہیں۔اِن میں کوئی خاتون نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے اُس وقت تک آرمینی خواتین بہت کم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ آئیں۔تاہم اِس قبرستان میں فیلومینار رگیلینی(Phelomina Reghelini) متوفی جولائی ۱۹۲۷ء تک، جو کہ سندھیا کی فوج کے کرنل ڈیوڈ جیکب کی پوتی تھیں، ایک سو گیارہ افراد کی قبریں موجود ہیں۔ڈیوڈ جیکب آرمینی والدین کے ہاں ۱۷۵۵ء میں دہلی میں پیدا ہُوئے۔وہ اپنی سپاہ بنا کر مقامی سرداروں کے لیے معاوضے پر لڑتے تھے۔۱۷۸۰ء میں اُنھوں نے سندھیا کے فوجی کماندار جنرل ڈی بوگنی(De Boigne) کو اپنی خدمات پیش کیں اور اوجین کی جنگ میں اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر کرنل کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔اُن کی وفات پر پورا گوالیار شہر سوگوار تھا اور اُنھیں قلعہ کی فصیل سے اُن کی عمر کے برابر ۹۵ بندوقیں فائر کر کے سلامی دی گئی۔انیسویں صدی کے اواخر میں جو واحد نامور آرمینی ہُوا وہ سورت کے آرمینی خاندان سے تعلق رکھنے والے ڈپٹی سرجن جنرل ڈاکٹر جے ایم جوزف تھے۔جو ۱۸۲۶ء کو بمبئی میں پیدا ہُوئے اور ۱۸۸۵ء کو مدراس میں وفات پا گئے۔ایلیزا کیورک(Eliza Kewark) جو لیڈی ڈیانا کی چوتھی پردادی(Fourth great-grandmother) تھیں، ان کے والد بھی آرمینی تھے۔پاکستان کی سرزمین پر ڈیرک جوزف(۱۹۴۵ء۔۲۰۲۱ء) معروف آرمینی ہُوئے ہیں جو پاکستان آرمی میں لیفٹننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز اور ۱۹۷۱ء میں جنگ میں شریک تھے۔اُنھیں تمغہ بجرأت سے نوازا گیا۔وہ پشاور میں پیدا ہُوئے اور وہیں وفات پائی۔اُن کے والد پال جوزف مشن ہسپتال پشاور میں جنرل سرجن تھے۔

آرمینیوں اور برِصغیر کے باشندوں کے تعلقات کا ذکر زینوفون(Xenophone ۴۳۰۔۳۵۵ ق م) کی ایک قدیم تصنیف میں بھی مِلتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۵۶ء میں شائع شدہ ایک آرکائیو ڈائریکٹری کے مطابق ایک آرمینی تاجر اور سفارتکار ۷۸۰ء میں مالابار کے ساحل پر پہنچا اور یوں آٹھویں صدی کے دوران مالابار ساحل کے قریب کیرالہ میں چند آرمینی بستیوں کا قیام عمل میں آیا۔برِصغیر میں جن آرمینی النسل اشخاص نے شہرت اور اہمیت حاصل کی اُن میں آئینِ اکبری کے مطابق شہنشاہ اکبر کے میرِ عدل(چیف جسٹس) میر عبدالحئی (م ۱۶۱۳ء) کا نام خاصا نمایاں ہے۔عبدالحئی کی بیٹی جولیانہ کی شادی ۱۵۹۰ء میں ایک آرمینی باشندے اسکندر مرزا (Alexander) سے ہُوئی جو حلب سے ایک تاجر کی حیثیت سے آگرہ آئے تھے اور بعد ازاں دربارِ اکبری میں رسائی حاصل کی۔جولیانہ کی وفات کے بعد اسکندر نے جولیانہ کی بہن سے دوسری شادی کی۔(نوٹ: یہاں اِس وضاحت کی ضرورت ہے کہ عبدالحئی کی بیٹی جولیانہ وہ لیڈی جولیانہ نہیں جو اکبر کی کسی عیسائی بیوی کی بہن تھی اور حرم میں بطور طبیبہ رہتی تھی اور جس کی شادی اکبر نے ۱۵۶۰ء میں فرانس کے پرنس جین فلپ ڈی بوربن سے طے کی جو کہ فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کا بھتیجا تھا۔پرنس جین فلپ اور لیڈی جولیانہ کی اولاد میں تین سو کے لگ بھگ افراد ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ کے بعد ناروا ڈر منتقل

ہُوئے) جہانگیر نے اسکندر مرزا اور اُن کے بیٹوں پر اسلام قبول کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالا مگر یہ کوشش بے سود رہی۔ اسکندر کے بڑے بیٹے الیگزینڈر کا نام اکبر نے مرزا ذوالقرنین (۱۵۹۴ء۔۱۶۵۶ء) تجویز کیا تھا۔ ولیم ہاکنز (Capt Willaim Hawkins) ۱۶۰۹ء میں انگلستان کے شاہ جیمز اول کے ایلچی کے طور پر برِصغیر میں وارد ہُوئے۔ جہانگیر نے اُنھیں یہاں رہنے پر آمادہ کرتے ہُوئے ۴۰۰ سواروں کا منصب اور ۳۲۰۰ پاؤنڈ کے برابر سالانہ الاؤنس کے ساتھ سورت میں ایک فیکٹری لگانے کی پیشکش کے علاوہ ایک آرمینی خاتون (مبارک شا کی بیٹی) سے شادی بھی کرا دی۔ تاہم ہاکنز کا سفارتی مشن پرتگالی وائسرائے کے دباؤ کے تحت ناکام ہُوا اور اُنھیں واپس لوٹنا پڑا مگر وہ سمندری راستے میں ہی چل بسے۔ ہاکنز برِصغیر میں شادی کرنے والے پہلے انگریز اور اُن کی آرمینی بیوی ۱۶۱۲ء میں برِصغیر سے انگلستان جانے والی پہلی شخصیت ہیں۔ اِسی طرح ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز ڈاکٹر جیمز شارٹ (James Short) نے پٹنہ میں ایک آرمینی خاتون میری (Mary) سے شادی کی جو ایک آرمینی تاجر میناس (Minas) کی بیوہ تھیں۔ اُن کی ایک بیٹی مریم اودھ کے شاہ غازی الدین حیدر کی ملکہ بنیں اور نواب سلطان مریم بیگم صاحبہ (ولایتی بیگم) کہلائیں۔ اِن مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آرمینیوں نے برِصغیر کی تجارتی اور اقتصادی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک اہم تجارتی گروہ کے طور پر وہ ہر نمایاں تجارتی مرکز پر موجود نظر آتے تھے۔

لسانی پس منظر

آرمینی زبان ہند یورپی لسانی خاندان کی ایک شاخ ہے۔ اِس زبان کے حروفِ تہجی ۴۰۵-۶ء میں پادری میسروپ میشٹوٹس (Mesrop Mashtots) نے متعارف کرائے۔ پتھروں پر کندہ تحریروں کے بعد پانچویں صدی عیسوی میں آرمینی میں ترجمہ ہونے والا بائبل کا نسخہ اس زبان کا قدیم ترین موجود سرمایہ ہے جس میں فارسی، یونانی ،اناطولیائی اور سریانی زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ اردو اور آرمینی میں بعض الفاظ تو ہو بہو مشترک ہیں اور بعض میں تلفظ کا معمولی فرق ہے جیسے:

اردو	آرمینی	اردو	آرمینی
آزاد	آزاد	آگاہ	آگاہ
افسوس	اپسوس	بازار	وزھار
بازو	بازوک	بخت	بخت
پاسبان	پاہپان	تاج	تاگ
جان	جان	چار	چورس
دربان	درپان	درد	درد
در	در	دشوار	دزوار
رگ	یرگ	رنگ	یرنگ
زندان	زندان	ساز	ساز
شاگرد	اشگرد	شکر	شگر
گرم	جرم	گوہر	گوہرمرد
مرد	موم	موم	
مُہر	مُہر	نم	نم
ورزش	ورز	یک	مک

اِن الفاظ میں سے آزاد، آگاہ، بخت، جان، درد، در، زندان، ساز، شکر، گوہر، مرد، موم، مُہر اور نم وغیرہ کا تلفظ دونوں زبانوں میں ایک سا ہے اور اردو میں یہ الفاظ سینکڑوں بار اِنھی آوازوں کے ساتھ استعمال ہُوئے ہیں البتہ لغت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سارے آرمینی الفاظ فارسی کے ہیں؛ جبکہ باقی الفاظ آرمینیا کی علاقائی زبانوں کے زیرِ اثر معمولی تغیر پذیری کے عمل سے گذرے جیسے اردو میں انگریزی کے سکول کو اسکول بنا لیا گیا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایران دُنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے جس کی خود مختاری کی گواہی ۳۲۰۰ ق م تک دی جاتی ہے جب کہ آرمینا کا وجود ۲۴۹۲ ق م کے قریب بتایا جاتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی مقدونیائی سلطنت میں شمولیت سے قبل ۳۳۱ ق م تک یہ علاقہ ایرانیوں کے زیرِ تسلط تھا جبکہ آرمینیا کی مشرقی سرزمینیں ۱۵۰۲ء سے ۱۸۲۸ء تک صفوی حکمرانوں کے تحت ایرانی مملکت کا حصہ رہیں اور مغربی زمینوں پر عثمانی سلطنت کا اختیار رہا۔ آرمینیا کا دارالحکومت یریوان (Werevan) ۱۵۱۳ء تا ۱۷۳۶ء کے درمیان چودہ مرتبہ کبھی صفویوں اور کبھی عثمانیوں کے زیرِ تسلط رہا۔ ۱۸۲۸ء میں ایرانی تسلط والے زیادہ تر علاقے روس نے ہتھیا لیے اور جدید جمہوریہ آرمینا ۱۹۹۱ء میں سویت یونین کی تحلیل کے نتیجے میں آزاد ہُوا۔ تاہم اِس مختصر سے جائزے سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آرمینیا کی علاقائی زبان تا دیر فارسی کے زیرِ اثر رہی اور مغربی سکالروں نے بھی کم سے کم ۱۸۷۰ء تک اِسے فارسی زبان ہی خیال کیا۔

آرمینی شاعری

آرمینی شاعری کا آغاز قبل مسیح دَور سے ہے جس میں اوّل اوّل مذہبی اور مقدس خیالات کا تذکرہ ملتا ہے جب کہ پانچویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سیکولر موضوعات کا آغاز ہُوا۔ آرمنی ادبیات میں پانچویں اور چھٹی صدی ماہرینِ الٰہیات اور مورخین کی صدی تھی۔ ساتویں صدی میں جغرافیہ دان اور مقالہ نگار سامنے آئے جن کے ساتھ دو شعرا کا ذکر بھی ملتا ہے: داوتک کتروگ (Davtak Kertogh) اور کومیتاس (Komitas Aghtsetsi)۔ کتروگ پہلا سیکولر آرمینی شاعر اور ادیب تھا۔ اُس نے کاکیشین البانیہ کے پہلے ساسانی شہزادے جیونشیر (Jevansher) کی موت پر مرثیہ لکھا تھا جسے عیسائیت قبول کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا تھا۔ کومیتاس آرمینی کیتھولک بشپ تھے اور ان کی شاعری مذہبی عقائد کی عکاسی کرتی ہے۔ سہک دخت

آٹھویں صدی کی ایک آرمینی شاعرہ تھیں۔ وہ آرمینی ادب کی پہلی مشہور خاتون ہیں جو بیک وقت ادب اور موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں۔ اسی صدی میں شاعرہ خسروی دخت (Khosrovidukht) کا نام بھی آتا ہے جنھیں اُن کے والد گوغثن کے بادشاہ خسروف گوغتنسی (Khosrov Goghtnastsi) کے قتل کے بعد بیس برس تک قید رکھا گیا۔ ۷۳۷ء وہ انتقال کر گئیں۔ اُن سے منسوب ایک روایتی حمد ہی اَب دستیاب ہے۔

گریگوری آف ناریک (Saint Gregory of Narek 951–1009) ریاست واسپورکان (Vaspurakan) کے رہائشی تھے جو اعلیٰ ثقافتی اور آرمینی تہذیب کا گہوارہ سمجھی جاتی تھی۔ اُنھوں نے ناریک میں اپنے ماموں کی خانقاہ میں مذہبی تعلیم پائی۔ ۹۷۷ء میں وہ پادری مقرر ہُوئے اور اپنی موت تک خانقاہ کے اسکول میں دینیات کے معلم رہے۔ وہ دنیاوی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ آرمینیا کے صوفی گیت نگار، راہب اور ماہرِ الٰہیات کے طور پر جانے جاتے تھے اور گرجا گھروں میں اُن کی تعظیم کی جاتی تھی۔ وہ ایک بشپ کے فرزند تھے اور دانشوروں میں آرمینیا کی مذہبی روایات کے تناظر میں محبوب اور اہم شخصیت خیال کیے جاتے تھے۔ وہ اپنے نوحوں کے مجموعہ کے لیے خاص طور پر معروف تھے جسے صوفیانہ ادب میں اعترافی دعا کا درجہ حاصل تھا اور تقریباً ہر آرمینیائی گھرانے میں اس کا نسخہ موجود تھا۔ اُن کی زیادہ تر شاعری خدا سے مخاطبت کے زمرے میں آتی ہے۔ مابعدالطبیعاتی اور وجودی مسائل اُن کے کلام کے مرکزی موضوعات رہے۔ اُن کے کلام کو بائبل کے بعد دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی کے ایک ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے گریگوری کے کلام کی بنیاد پر ایک انوکھی تھراپی تیار کی ہے جس سے بہت سی بیماریوں کا علاج ممکن ہے، کم از کم جزوی طور پر۔ گریگوری کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اُسے انگریزی کے علاوہ روسی، فرانسیسی، عربی، فارسی، لتھوینیائی، لیٹوین اور اسٹونین میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ گریگوری نے متعدد حمدیں، مذہبی شخصیات کے قصیدے، منتر اور دعائیں بھی سپردِ قلم کیں۔ وہ دینی تحریکوں کے مخالف اور راسخ العقیدگی کے ترجمان رہے۔ دستاویزی مذہبی منظومات میں اُنھیں آرمینیائی ادب میں اولیت حاصل ہے۔ اُن کے فلسفے کا مرکزی خیال ابدی نجات ہے جس کا انحصار کلی طور پر ایمان اور فضلِ الٰہی پر ہے۔ وہ جاگیرداری کے خلاف اور انسانیت پسندانہ نظام کے حامی رہے۔ مائیکل پاپازین (Michael Papazian) کا کہنا ہے کہ اگر آپ آگسٹائین اور جیمس جوائس کو عبور کر لیتے ہیں تو آگے گریگوری ہی ملے گا۔ رابرٹ تھامسن کے مطابق وہ پوری آرمینیائی مذہبی روایت کے سن سے اہم شاعر تھے۔ ناقدوں نے اُنھیں عالمی قد کا شاعر تسلیم کرتے ہُوئے دانتے کے برابر جگہ دی ہے اور آرمینیائی قومی اور کلیسائی ثقافت میں ایک منفرد شخصیت قرار دیا ہے۔ آیئے اُن کی ایک نظم پڑھتے ہیں:

مسیح کا بچہ

مسیح کے بچے کے ہونٹ جڑواں پتوں کی طرح ہیں
جب وہ مسکراتا ہے تو جیسے گلاب گرتے ہیں۔
مسیح کے بچے کے آنسو موتی ہیں جو وہ غم کرتا ہے؛
مسیح کے بچے کی آنکھیں سمندر کی طرح گہری ہیں
جیسے انار کے دانے اس کے ڈمپل ہیں،
اور اس کے رستے میں کنول کے جھرمٹ پھوٹ
پڑتے ہیں۔

نرسز شنورالی (Saint Nerses Shnorhali ۱۱۰۲ء۔۱۱۷۳ء) والد کی جلد وفات کے باعث اپنے نانا کی سرپرستی میں ایک خانقاہ میں رہے جہاں اُنھیں ایک ماہرِ الٰہیات کے سپرد کیا گیا۔ وہ سترہ برس کی عمر میں کیتھولک پادری مقرر ہُوئے اور ۳۵ سال کی عمر میں بشپ کے عہدہ پر پہنچے۔ اُنھوں نے قدیم خیالات کے حامل مشرقی چرچ کے ساتھ مفاہمت کے لیے بازنطینی بادشاہ کے ذریعہ ایک سفارتی کونسل بلائی تا کہ دونوں اعتقادات کے حامل گرجا گھروں کو ملانے پر تبادلۂ خیالات ہو سکے لیکن بادشاہ نے اس مقصد کے لیے جو شرائط عائد کیں وہ دونوں دھڑوں کے لیے ناقابلِ قبول تھیں جس کی وجہ سے مذاکرات کامیاب نہ ہو پائے۔ ۱۱۶۵ء میں نرسز نے آرمینی شہزادوں کی جنگ میں کامیاب ثالثی کا کردار ادا کیا۔ وہ ایک ماہرِ الٰہیات شاعر، مصنف اور حمدیہ موسیقار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے مذہب کے علاوہ شاعری اور موسیقی کے شعبوں میں بھی نمایاں کام کیے۔ اُن کی متعدد منظومات کو آرمینیائی حمدیہ عبادتوں میں پڑھا جاتا ہے۔ یہاں اُن کی ایک نظم کا اردو ترجمہ آپ کی نذر کیا جاتا ہے:

صلیبیوں کی آمد

ایک بار پھر خدا اُن کے راستے کو آگے بڑھاتا ہے؛
بے شمار پیادوں اور گھوڑوں کے ساتھ،
جیسے ہی لہریں ساحل کی طرف بڑھتی ہیں،
وہ شدید اور طوفانی طور پر اُترتے ہیں۔
سمندر کے کنارے پڑی ریت کی طرح،
یا آسمان پر بکھرے ستاروں کی مانند،
وہ جہاں جاتے ہیں زمین کو بھر دیتے ہیں
اور اسے اون یا برف کی طرح سفید کر دیتے ہیں
اُن کی آواز شمالی ہَوا کی طرح ہے،
طوفانی بادل کو عقب سے چلاتی ہُوئی۔
وہ سرے سے سرے تک زمین صاف کرتے ہیں،
جو کافر آگے بھیجتے ہیں،
ایسی ناامیدی سے نجات
جو تمام مسیحی اپنے اندر رکھتے ہیں۔
اب گرجا گھروں میں سردی اور اندھیرا

ایک بار پھر موم بتی کی چنگاری جلا دے گا؛
اور تم، میرے بیٹے، دیر سے بھاگنے پر مجبور
مجھ سے دُور دراز کے علاقوں کی طرف،
اَب رتھوں کے میلے میں واپس آئیں گے
جنھیں نایاب آرائشوں سے مزین بہادر جنگی گھوڑے کھینچتے ہیں۔
اور مَیں اپنی آنکھیں اُوپر اُٹھاؤں گا
اُنھیں اپنے قریب دیکھنے کے لیے جنھیں مَیں پیار کرتا ہُوں۔
تمھارے لیے اپنے بازو جوڑ دوں گا،
اَن کہی خوشی مناتے ہُوئے؛
اور میری کالا لباس ایک طرف رکھا جائے گا
اپنے ہم جنسوں کی سبز اور قرمزی پوشاک پہننے کے لیے۔

فریک (Frik ۱۲۳۰ء۔۱۳۱۰ء) تیرھویں صدی کے آرمینیائی شاعر تھے۔ اُنھوں نے مذہبی اور غیر مذہبی دونوں موضوعات پر شاعری کی جسے سماجی تنقید کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ وہ آرمینیا پر منگول حکمرانی کے دور میں زندہ رہے۔ اُن کی پچاس کے قریب منظومات دستیاب ہیں جو مقامی بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اِن میں سے بعض منظومات میں منگول حکمرانوں پر سخت لائینیں اور عدم مساوات پر احتجاجی رویہ اِس لیے بھی قابلِ فہم ہو جاتا ہے کہ منگولوں نے اُن کے بیٹے کو اغوا کر لیا تھا؛ وہ اُس کی تلاش میں ملک بھر میں مارے مارے پھرے اور پھر زندگی کے آخری سال ایک خانقاہ میں گذارے۔ اُن کی دو معروف منظومات کے عنوان مسیح سے شکایت (Complaint to Christ) اور قسمت کے خلاف (Against the Fate) ہیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام ۱۹۳۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اُن کی ایک نظم کا ترجمہ دیکھیے:

سرزنش ہا

اے خدائے عدالت و راستی،
سب سے پیار کرنے والا اور بے رحمی سے بھرا
مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے
اگر تُو چاہے تو تیرا بندہ سُن لے۔
دیکھ، دُنیا ہمیں کس طرح دُکھ دیتی ہے
غلطیوں اور عذابوں کے ساتھ
اور تُو ہر ایک کو معاف کرنے والا ہے
مگر صرف ہماری پریشانیوں سے منہ موڑے ہُوئے ہے۔
اے رب، تُو ہماری کوتاہی کا بدلہ نہیں لے گا
نہ ہی اُن بدیوں کا پیچھا کرے گا جو ہمیں گھیرے ہُوئے ہیں
تُو جانتا ہے، ہم گوشت اور ہڈی ہیں
ہم پتھر سے بنے مجسمے نہیں!
ہم گھاس یا سرکنڈوں سے نہیں بنے
کہ تُو ہمیں گھاس پھوس کی طرح استعمال کرتا ہے
گویا کہ ہم کانٹے دار کھیت ہیں
یا چوب قلم موکی طرح جنگلوں کی پیداوار
اگر ہم خود اِس قابل نہیں ہیں
اگر ہم نے زمین پر کوئی اچھا کام نہیں کیا
اگر ہم تیری نظر میں قابلِ نفرت ہیں
کہ تُو ہمیں اِس حال میں چھوڑ دے
پھر ہمیں مٹا دے؛ مختصراً اور جلد
تا کہ تیرے پاک دل کو سکون مِلے
یہ تیرا ارادہ ہو سکتا ہے
اچھے، عظیم اور قادرِ مطلق رب۔
ہمیں کب تک صبر سے انتظار کرنا
اور اپنی قسمت کو برداشت کرنا چاہیے
شریروں کو بہا لے جا
کہ وہی ٹھہریں جن پر تُو احسان کرتا ہے!

نہاپت کوچک (Nahapet Kuchak) متوفی ۱۵۹۲ء قرونِ وسطیٰ کے آرمینیائی شاعر تھے جو اپنی قطعہ نما چار سطری شاعری کے لیے مشہور تھے جن میں ایک ہی مضمون کو سمویا جاتا تھا۔ محبت کوچک کا پسندیدہ موضوع تھا لیکن اُنھوں نے سماجی موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ عقیدہ پرستوں کے لیے اُن کی شاعری میں ایک چیلنج تھا۔ اُن کے بعد آنے والوں نے حقیقی گیت نگار کی حیثیت سے اُن کی انفرادی صلاحیتوں کو سراہا۔ ۱۹۸۴ء میں شاعرہ ڈیانا ڈیر ہووہنیسین (Diana Der Hovennesian) نے اُن کی دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ جانے والی منظومات کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ ذیل میں کوچک کی ایک نظم کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

اے رات، لمبی ہو جا

اے رات، طویل رہ۔۔ ایک نا مختتم سال کی طرح!
اُتر، گھنے اندھیرے، سیاہ اور خوف بھرے!
آج رات میرے دل کی خواہش پوری ہوگی۔۔
میری محبت آخر یہاں ہے جیسے ایک چھپا ہُوا مہمان!
صبح، سات پہاڑوں کے پیچھے کھڑی ہو جا۔۔
نظروں سے دُور،
کہیں ایسا نہ ہو میری محبت تیری روشنی سے نکل جائے
یوں مَیں ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں آرام کروں گا
تبھی مَیں اُسے اپنے سینے سے لگا سکتا ہُوں۔

سایات نووا (۱۴ جون ۱۷۱۲ء۔ ۲۲ ستمبر ۱۷۹۵ء Sayat Nova) کا پیدائشی نام ہاروتیون سیاتیان تھا۔ وہ بیک وقت شاعر اور موسیقار تھے اور متعدد زبانوں سے واقف تھے۔ شاہی دربار میں کسی عہدہ پر تھے مگر بادشاہ کی بہن انا (Ana) سے محبت کے نتیجے میں اپنی حیثیت کھو بیٹھے اور باقی زندگی گھوم پھر کے گذاری۔ ۱۷۵۹ء میں وہ چرچ کے پادری ہو گئے۔ ۱۷۹۰ء میں ایران کے شاہ قاجار کے حملہ میں

اُنھیں قبولِ اسلام پر مجبور کیا گیا لیکن ان کے انکار پر پھانسی دے دی گئی اور سر قلم کر دیا گیا۔ اُنھیں اپنے زمانے میں شاعری اور موسیقی کے حوالے سے عظیم سمجھا گیا۔ وہ باطنی طور پر اگرچہ مذہبی جھکاؤ رکھتے تھے مگر اُن کی شاعری میں رومانیر اور سیکولرازم کی نمایاں جھلک موجود ہے۔ ذیل میں ان کی ایک ترجمہ شدہ نظم ملاحظہ کیجیے:

مَیں نے آج اپنی محبت کو دیکھا

مَیں نے آج اپنی محبت کو دیکھا، راہِ چمن میں وہ بھٹک گئی،
فرشِ چمن زربفت اور سنہرے نقوش سے مزین تھا
ایک بلبل کی طرح پر پھیلائے مَیں اپنے گلاب کے گرد گھوما
مَیں اشکبار تھا اور میرا دل بہت اداس تھا
میرے رب، ایسے غم میں میرے تمام دشمنوں کو دھوکہ دیا جائے!
اے محبت، اپنے اس طنز و مزاح سے تو نے مجھے برباد کر دیا
تو نے خود ہی عشق کا امرت پیا ہے، تیرے ہونٹ دل سے بولتے ہیں
ان شہد بھرے الفاظ سے تو نے مجھ جیسے کتنوں کو اپنے ساتھ باندھا
خنجر لے لو اور مجھے فوراً مار ڈالو۔ تمسخرانہ انداز میں میرے قریب سے نہ گذرو
چونکہ مَیں محبت سے مرتا ہُوں، یہ بہتر تھا کہ خوبصورت وار کر کے مجھے آزاد کر دیا جائے
کیونکہ مجھے تمھارے علاوہ کسی سے پیار نہیں۔۔ مَیں تمہیں یہ اچھی طرح باور کرانا چاہتا ہُوں
تمھیں، جس کے لیے مَیں موت کا صدمہ اُٹھاؤں گا، مجھے جو کچھ بتانا ہے اسکی فہرست بنالو
دیکھا اپنے خالق کو ناکام نہ کر، تمام ماضی دُور نہیں ہوتا
سیات نوا غصہ نہ کر، جب وہ تیرے جال میں پڑا

وہ طنز و مزاح کے سحر سے بے نیاز تھا۔

ایوتک سحاق اسحاقیان (۳۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء Avetik Sahak Isahakyan) ممتاز آرمینیائی گیت نگار، مصنف اور عوامی کارکن تھے۔ لیپزگ یونیورسٹی سے فلسفہ اور بشریات میں تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں ہی ادب اور سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور آرمینیا کی انقلابی فیڈریشن کی صفوں میں شامل ہو کر مسلح گروہوں کی حمایت کرنے لگے تھے جس کیا پاداش میں گرفتار ہُوئے اور جیل کاٹی۔ بعد ازاں ملک سے چلے گئے اور زیورخ یونیورسٹی میں ادب اور فلسفہ کی مزید تعلیم حاصل کر کے ۱۹۲۰ء میں واپس آئے مگر ۱۹۰۸ء میں دیگر دانشوروں کے ساتھ پھر گرفتار ہُوئے اور قریباً چھ ماہ بعد ضمانت پر رہائی عمل میں آئی۔ اَب قفقاز میں اُن کا رہنا ممکن نہ رہا تھا لہٰذا ۱۹۱۱ء میں وہ برلن ہجرت کر گئے جہاں جرمن دانشوروں کے ساتھ مل کر جرمن آرمینیائی تحریک کے علاوہ جرمن آرمینین سوسائٹی کا قیام عمل میں لائے۔ اس دوران اُنھوں نے اپنی سماجی اور سیاسی تحریروں میں آرمینیوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کی اور آرمینی حکومت کی بحالی کے موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ پیرس چلے گئے لیکن ۱۹۳۶ء میں مستقل طور پر آرمینیا واپس آ گئے۔ ۱۸۹۷ء میں اُن کا پہلا مجموعہ ''گیت اور زخم'' (Songs and Wounds) شائع ہُوا۔ اُن کی منظومات میں وطن اور ہم وطنوں سے محبت کے جزبات نمایاں ہیں۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیانی عرصہ میں اُن کا ایک اور مجموعہ ''ہائیڈکس کے گیت (Songs of Haiduks) مرتب ہُوا جو آرمینیا کی جدوجہدِ آزادی کی اولین تخلیقات میں شمار ہوتا ہے جس میں آرمینیائی باشندوں کی اپنے آبائی ساحلوں کو لوٹ جانے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ ان کے مصرعوں میں دُکھ بھری محبت کا احساس اور انسانیت پرستی کی جھلک ملتی ہے۔ یہاں ان کی ایک مختصر نظم کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

کالی آنکھیں

کالی آنکھوں پہ بھروسہ نہ کرو، بلکہ ان سے ڈرو
وہ اداس ہیں، اور نہ ختم ہونے والی رات
پریشانیاں اور خطرات ان کے قریب چھپے ہُوئے ہیں
ان کی چمکتی روشنی سے محبت نہ کرو!
میرے دل میں خون کا سمندر ہے،
ان کی بے رحم قوت سے بلایا گیا،
اس سیلاب میں کبھی سکون نہیں
ان کی چمکتی روشنی سے محبت نہ کرو!

برصغیر آنے والے یورپین اصحاب میں ایک قابلِ لحاظ تعداد یہاں کے ادبی بالخصوص شعری منظر نامے پر متحرک نظر آتی ہے۔ پرتگیز یوں سے قبل برصغیر میں آرمینی عیسائی ادبا و شعرا موجود تھے جن میں سے دستیاب شعرا و شاعرات کا احوال اور منتخب کلام یہاں درج کیا جاتا ہے:

سرمد کاشانی (۱۵۹۰ء۔ ۱۶۶۱ء) شاہجہاں کے زمانے میں ایک ایرانی آرمینی شاعر سرمد کاشانی فارس سے بذریعہ سمندر بغرضِ تجارت ۱۶۳۴ء میں برِصغیر آئے اور ٹھٹھہ میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ وہ ۱۵۹۰ء میں آرمینیا کے ایک یہودی تاجر کے گھر پیدا ہُوئے۔ اس زمانے میں آرمینیا میں فارسی کا رواج تھا اور سرمد کے والدین اس زبان سے واقف تھے، خود سرمد نام بھی فارسی ہے۔ سرمد نے تورات کا فارسی ترجمہ بھی کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ملا صدرہ یعنی صدر الدین محمد شیرازی (شیراز ۱۵۷۲ء۔ ۱۶۴۱ء بصرہ) اور میر ابوالقسم میر فندرسکی (۱۵۶۲ء۔ ۱۶۴۰ء) کی معیت میں اسلام کی طرف مائل ہُوئے۔

ٹھٹھہ میں جب اُن کی ملاقات ایک ہندو لڑکے ابھی چند سے ہُوئی، جو کسی درگاہ پر گایا کرتا تھا، تو سرمد کی آنکھیں ماسوا کی طرف سے بند ہو گئیں اور وہ اُس

کے عشق میں گرفتار ہو کر ٹھٹھہ شہر کی گلیوں میں برہنہ پھرنے لگے اور اُس کے گھر کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے۔ سرمد کی پاکیزگیِ خیال کو دیکھتے ہُوئے لڑکے کے والد نے اُنھیں ملنے کی اجازت دے دی اور وہ لڑکے سمیت شاہجہان آباد آ گئے جہاں داراشکوہ بھی اُن کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ یہاں قیام کے دوران عالمگیر نے قاضی القضاۃ ملاقوی کو بھیجا کہ وہ سرمد سے اُس کے برہنہ رہنے کا سبب پوچھیں۔ سرمد نے ملاقوی کے جوب میں کہا کہ ''شیطان قوی است'' جسے ملاقوی نے خود پر چوٹ تصور کیا اور عالمگیر کے کان بھرے جس کے نتیجے میں ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں سرمد کو جامع مسجد دہلی کے قریب سر قلم کر کے قتل کیا گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اُنھیں رسول اکرمؐ کے لیے ایک گستاخانہ رباعی لکھنے کی پاداش میں یہ سزا دی گئی:

ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

مزید یہ کہ سرمد نے شاہجہان کے بعد داراشکوہ کے بادشاہ بننے کی پیشن گوئی کی تھی، نیز یہ کہ وہ کلمہ طیبہ آدھا پڑھا کرتے تھے۔ ان سب باتوں نے مل کر سرمد کے قتل کا سامان تیار کیا۔

مرزا ذوالقرنین (۱۵۹۴ء۔۱۶۵۶ء) آرمینی تاجر اسکندر مرزا کے فرزند تھے جو اکبر کے زمانے میں حلب سے برِ صغیر آئے اور دربارِ اکبری تک پہنچے۔ ۱۶۱۳ء میں اسکندر کی وفات کے بعد سانبھر کا انتظام ذوالقرنین کے سپرد ہُوا۔ وہ جہانگیر کے دربار میں امیر اور سانبھر کے فوجدار اور شاہجہان کے دربار میں آرمینیائی نسل کے دیوان اور ایک وقت میں لاہور کے صوبیدار بھی رہے۔ یہاں اِس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ بچپن میں ذوالقرنین شاہی محل میں شاہجہان کے ہمجولی رہے۔ ذوالقرنین سب سے قابلِ ذکر آرمینی عیسائی باشندے تھے اور اُن جیسی عزت و شہرت کسی دوسرے آرمینیائی کو حاصل نہ ہو سکی۔ اُنھوں نے دباؤ کے باوجود اپنا عقیدہ تبدیل نہیں کیا۔ ۱۶۵۴ء میں اُنھوں نے اپنی جاگیر سے رخصت لی اور سو روپیہ یومیہ پنشن پر دلی آ بسے جہاں ۱۶۶۵ء میں وفات پائی۔ اُن کی اپنی اہلیہ ہیلینا (Dona Ilena, d. 1638) سے تین بیٹے آبزروم (جان بپٹسٹ)، مرزا ایرس (گیسپر)، مرزا دانیال (مائیکل) اور ایک بیٹی کلارا ہُوئی۔ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ہندوستان میں رہنے والے آرمینیوں میں ایک اہم شخصیت تھے۔ شاہجہان کی تاجپوشی پر اُنھوں نے قصیدہ پیش کیا اور چار ہزار روپیہ انعام پایا۔

برِ صغیر میں موجود آرمینی انیسویں صدی کے آغاز میں اُردو شاعری کی جانب متوجہ ہُوئے۔ ذیل میں جن شعرا و شاعرات کا ذکر ہے اُن کے بارے میں بعض مورخین اور ناقدین کا خیال ہے کہ وہ آرمینی النسل نہ تھے تاہم بعض دُوسرے ذرائع ان کے آرمینی النسل ہونے کے حق میں ہیں جیسے:

جوزف جوہانس صاحب Joseph Johannes Sahab۔ شاگرد صبا میر وزیر علی (۱۸۰۵ء۔۱۸۵۵ء)۔ آرمینی نصرانی تھے۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہناتے ہو زنجیر پہ زنجیر عبث

بادشاہ بیگم خفی دہلوی۔ ۱۸۳۰ء سے قبل پیدا ہُوئی اور ۱۸۷۷ء تک حیات تھیں۔ اُن کے والد ایڈورڈ مارسٹن بلیک اور والدہ وزیر خانم زہرہ تھیں۔ والد نے سوفیہ نام تجویز کیا لیکن والدہ کی پُرزور خواہش پر بادشاہ بیگم نام رکھا گیا اور شادی ایک اینگلو انڈین فوجی افسر الیگزینڈر سکنر (Alexander Skinner) سے ہُوئی۔ مارٹن بلیک عرف امیر مرزا بادشاہ بیگم کے بھائی، بہادر مرزا بیٹے اور احمدی بیگم (عیسائی نام شارلٹ) بیٹی تھیں۔ بادشاہ بیگم کی دُوسری شادی محمد امیر اللہ سے ہُوئی۔ ادبی حلقوں میں بادشاہ بیگم ''مس بلیک خفی'' عرف یوسف والی کے نام سے جانی گئیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی جانتی تھیں۔ اطلاع ہے کہ تینوں زبانوں میں شعر بھی کہتی تھیں۔ خوش نویسی اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔

خُود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیّاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم
اے حقّی اپنے اشک بے تاثیر
مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

ایرن جیکب ایرن فرحت گورکھ پوری Irene S. Jacob Farhat۔ شاگرد ریاض خیر آبادی۔ آرمینی نصرانی تاجر تھے۔

شکستہ خاطری ہے فرقتِ ساقی میں کچھ ایسی
بہت ملتی ہے ٹوٹے جام سے صورت مرے دل کی
ترا تیر دل سے جدا ہو رہا ہے
یہ ظلم او کماندار کیا ہو رہا ہے
شبِ وصل وعدہ وفا ہو رہا ہے
حیا آ کے کہتی ہے کیا ہو رہا ہے
یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل
خبردار کس کا گلہ ہو رہا ہے

سارہ پری۔ عرف بی میجو۔ آرمینی رقاصہ اور کلکتہ کی حسینانِ بازاری میں سے تھی۔ اردو فارسی عربی اور انگریزی سے واقف تھی۔

عشق میں بے تاب کیوں ہے تجھ کو اے دل کیا ہُوا
کیوں تڑپتا ہے برنگِ مرغِ بسمل کیا ہُوا
غیر سے مِلنا بھی چھوڑا ہے نہ چھوڑیں گے کبھی
اے پری شکوہ کیا تُو نے تو حاصل کیا ہُوا
ہے رُخِ غیرتِ قمر کی تلاش
شبِ گیسو کو ہے سحر کی تلاش
جب ختم ہو چکی تری بیداد کی غرض
نے حسرتوں کا غم ہے نہ فریاد سے غرض
یہ کیوں بزم میں غیر آئے ہُوئے ہیں
بتاؤ تو کس کے بُلائے ہُوئے ہیں
مِلاؤ نہ ہم کو جو یُوں خُدا را
یہ سمجھو تو کس کے بنائے ہُوئے ہیں

''جو آقاؐ کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''

نسیمِ سحر

ریاض ندیم نیازی کی ''جو آقا ﷺ کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''

وطنِ عزیز کے صوبۂ بلوچستان کے شہر سبّی میں مقیم ریاض ندیم نیازی شعر و ادب کے حوالے سے پورے پاکستان کے علاوہ اردو کی دیگر تمام بستیوں میں بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ حمد و نعت کے علاوہ اپنے تخلیقی وفور کی زرخیزی سے غزل، نظم، منقبت، سلام، ہائیکو اور دیگر کئی اصنافِ شعری کے چمنستان کو ہرا بھرا کر رہے ہیں۔ انہیں سرکاری طور پر کئی قومی اور صوبائی ایوارڈ مل چکے ہیں جبکہ غیر سرکاری طور پر بھی انہیں لاتعداد ایوارڈ اور توصیفی اسناد مل چکی ہیں۔ تاحال ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی تک اُن کا ذہن اور قلم بدستور سرگرمِ عمل ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص غمِ روزگار کے معاملات کے علاوہ کئی دینی و سماجی مصروفیات میں الجھا ہوا ہو کر بھی تخلیقی عمل میں شب و روز کس طرح مصروف رہ کر نت نئے زاویوں اور جہات سے کائناتِ ادب میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔

ان کی مختلف اصنافِ ادب پر مشتمل تمام کتابوں پر اظہارِ خیال کرنا ایک مضمون میں تو کسی طور ممکن نہیں کہ ''سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے''۔ اس وقت ان کے ایک منفرد انداز کے نعتیہ مجموعے ''جو آقا ﷺ کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں'' کا ذکر مقصود ہے۔ منفرد اس لیے کہ ایک سو چوراسی صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ریاض ندیم نیازی نے اپنی تخلیقی ہنرکاری سے مرزا غالبؔ کی غزلوں کی زمینوں میں ایک حمد اور انہتر نعتوں سے اس طور سجایا ہے کہ اُن کی عقیدتی سرشاری کے ساتھ ساتھ فنی ریاضت کی گواہی دیتے ہوئے ہر صفحے پر رشک آتا ہے۔ اور یہ نعتیں پڑھتے ہوئے حیرت بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے مرزا غالبؔ کی غزلوں کی زمینوں میں نعت کہتے ہوئے اُن کے موضوعات سے کتنی عمدگی سے گریز کرتے ہوئے ہر شعر کو خالص نعت کا شعر بنایا ہے۔

غزل کے حوالے سے تو غالبؔ کی دائمی اہمیت تسلیم شدہ ہے مگر نعت گوئی کی نسبت سے بھی غالب کی غزلوں کی زمینوں میں جو نعت گوئی ہو رہی ہے اس کا بالواسطہ کریڈٹ بھی غالب ہی کو جانا چاہیے کہ اس کی زمینوں نے نعت گو شعراء کو بھی اپنے موضوعاتی اور تخلیقی سفر میں کس قدر متاثر کیا ہے۔ نئے امکانات کی تلاش میں جہاں شعرائے پاکستان نے ماضی میں نعت کے دائرے سے خارج بے شمار موضوعات بھی نعت گوئی میں شامل کیے ہیں وہیں انہوں نے ماضی کے سرمائے کو بھی کھنگالا ہے۔ اردو نعت گوئی کے سال ہا سال کے سفر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ شعراء کے ہاں غالبؔ جیسے باکمال شاعر کی غزلوں کی زمینوں میں بھی نعت گوئی کا ایک واضح رجحان ملتا ہے۔ ریاض ندیم نیازی بھی نعت گو شعراء کے اس قافلے میں شامل ہیں جنہوں نے مرزا غالبؔ کی غزلیہ زمینوں میں نعتیں کہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر خورشید رضوی: ''اُن کے ہاں ریاضتِ فن بھی صاف نظر آتی ہے اور قدرتِ کلام بھی۔ تاہم نعت، ریاضت اور قدرت دونوں سے ماورا 'چیزے دِگر' کا بھی مطالبہ کرتی ہے، یعنی ایک جذبِ والہانہ جس کے بغیر شاخِ سخن کو بادِ سحر گاہی کا نم میسّر نہیں آتا''۔

غالبؔ کی غزلیہ زمینوں میں ریاض ندیم نیازی سے پہلے بھی کئی شعرائے کرام نے نعتیں کہی ہیں جن میں ساجد اسدی، راغبؔ مراد آبادی، منظر عارفی، ایاز صدیقی، بشیر حسین ناظم جیسے قادر الکلام شاعر شامل ہیں، اور اب ریاض ندیم نیازی کی صورت میں اس مختصر فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا ہے۔

یہاں ریاض ندیم نیازی کے بعد اس میدان میں آنے والے ایک اور نعت گو شاعر پروفیسر محمد طاہر صدیقی کا ذکر بھی خارج از موضوع نہ ہو گا جنہوں نے کالی داس گپتا کے مرتب کردہ دیوانِ غالبؔ کی تمام غزلوں قصیدوں قطعوں اور رباعیوں پر مکمل نعتیں لکھیں اور ان کے نعتیہ دیوان ''کلیاتِ نعت'' میں غالب کی زمینوں میں ۴۸۹ نعتیں شامل ہیں۔ عہدِ موجود میں دیگر کئی شعرائے کرام بھی طرزِ غالبؔ میں نعتیں تخلیق کر رہے ہیں جو تخلیق کی کائنات میں وسعت کا احساس دلا رہا ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی غالبؔ کی زمینوں میں نعت گوئی پر عہدِ حاضر کے ایک اہم شاعر ڈاکٹر سید قاسم جلال ان کی شعری توفیقات کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب کہتے ہیں کہ انہیں غالب کی طرح مشکل پسندی سے سادہ اسلوب کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی سفر طے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے تو صرف غالبؔ کی زمینوں میں نعتیہ اشعار لکھنے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے موضوعاتِ فکر اور طرزِ اظہار کو ویسے ہی رکھا جو اُن کے شعری مزاج کا حصّہ ہیں''۔ ایک اور اہم بات اس کتاب کے ایک دیباچہ نگار ڈاکٹر اختر ہاشمی نے کہی ہے کہ ''انہوں نے غالبؔ کی معروف غزلیات کا انتخاب کیا اور ان کے مصرعوں کو طرح بنا کر نعتیں کہیں، مگر چوں کہ یہ نعت تھی اس لیے انہوں نے غالبؔ کی غزل کے مصرع طرح پر گرہ نہ لگائی''۔

مجموعی طور پر ریاض ندیم نیازی کی ان طرحی نعتوں میں ان کی ریاضت، ان کی فنی ہنرکاری، نعت گوئی کے حوالے سے آداب کا اہتمام اور احتیاط پسندی ہر لفظ میں بول رہی ہے، انہوں نے غالبؔ کی زمینوں میں تو نعتیں کہیں مگر غالبؔ کی مشکل پسندی سے حتیٰ الامکان پہلو بچائے رکھا اور سلیس، عام فہم الفاظ میں قاری کے لیے ابلاغ کی آسانی پیدا کی ہے،

غزلیں

انور ندیم علوی

❁

پل میں ٹوٹا حجاب اشکوں کا
ایک دریا ہے، آب اشکوں کا
باریابی کا اِذن ملنے تک
بند کرنا نہ باب اشکوں کا
آہ مظلوم کی سوالی ہے
اب تو آئے جواب اشکوں کا
آگ نمرود کی، مقابل ہے
چشمِ پرنم، سحاب اشکوں کا
نام اپنے ہی کیوں لکھا تم نے
زندگی! انتساب اشکوں کا
شبنمی آنکھ، پھیلتا کاجل
کون دے گا حساب اشکوں کا
کاش تم بھی ندیمؔ! سن لیتے
گوشِ دل سے رباب اشکوں کا

❁

یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
عشق ہے اور بلا ضرورت ہے
عمر بھر کی یہی ریاضت ہے
ابنِ آدم سے کی محبت ہے
رات، یادیں، ہجومِ تنہائی
اشک آنکھوں سے کی عبادت ہے
لوگ پتھر اٹھائے پھرتے ہیں
میں نے اتنا کہا ''محبت ہے''
پھول زخموں کے، تاج کانٹوں کا
باغباں کی بڑی عنایت ہے
یاد رکھنا ہے اپنی مجبوری
بھول جانا تمہاری عادت ہے

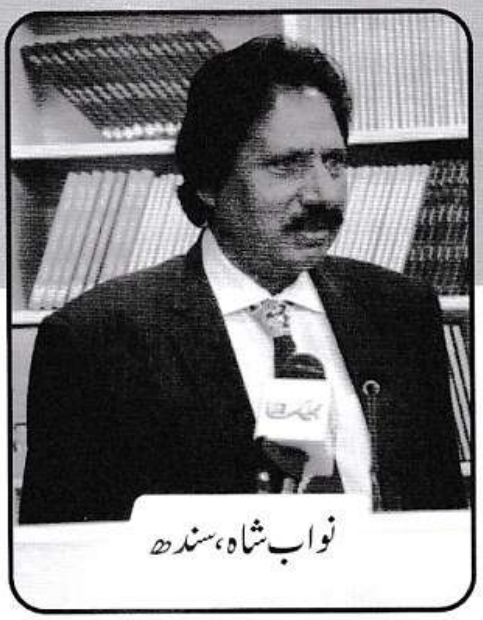

نواب شاہ، سندھ

غم کو اپنا ندیمؔ ہے سمجھا
جانِ جاں! یہ تری امانت ہے

❁

دستکیں رات بھر کوئی دیتا رہا
تیز طوفان میں کون در کھولتا
دور اپنوں سے پردیس میں، اجنبی
سارا دن عید خود سے ہی ملتا رہا
زلف ناگن کہو، آنکھ تھی میکدہ
کوئی ڈستا رہا، کوئی پیتا رہا
شاہ کے سامنے سر سبھی جھک گئے
ایک باغی کا سر زینتِ دار تھا
زندگی بھی ہے زنجیر، گویا ندیمؔ
توڑ کر خودبخود کون ہوگا رہا

❁

ہر خزاں دیدہ کو گلزار کیا ہے میں نے
زندگی! تجھ کو بہت پیار کیا ہے میں نے
سر جھکانے کے عوض شاہ عنایت کر دے
ایسی دستار سے انکار کیا ہے میں نے
پیار انسان سے ہے جرم تو منصف سن لے
گرم اسی جرم کا بازار کیا ہے میں نے
'حق' ہے بولی مری 'منصور' قبیلہ میرا
یہی اعلان سرِ دار کیا ہے میں نے

شاہ کے سامنے سر سبھی جھک گئے
ایک باغی کا سر زینتِ دار تھا

جس کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے ساری محفل
آج اسے مائلِ گفتار کیا ہے میں نے
جو بھی اُس چاند کو چاہے، اُسے چاہو تم بھی
چاند چہروں سے بہت پیار کیا ہے میں نے
چشمِ خوابیدہ کو اس پیار کی شبنم سے ندیمؔ
کتنے ارمانوں سے بیدار کیا ہے میں نے

❁

کتنی بدلی سارے گلشن کی فضا؟ کیسے کہوں
اڑ گئی امن و سکوں کی فاختہ، کیسے کہوں
بے اماں ہیں سب پرندے کیا ہوا، کیسے کہوں
ہم صفیرو! آشیاں کیوں کر جلا، کیسے کہوں
گھٹتے گھٹتے مٹ گیا انسان کا سایہ، مگر
بڑھتے بڑھتے بن گئے بندے خدا، کیسے کہوں
ایک منزل، راستے بھی ایک تھے اپنے کبھی
دو دلوں میں بڑھ گیا پھر فاصلہ، کیسے کہوں
کوئی خوشبو ساتھ چلتی ہے سدا جیسے نسیم
جو بسا ہے روح میں اس کو جدا کیسے کہوں
بے وفا محبوب جیسی زندگی انور ندیمؔ
روٹھ کر چل دی اچانک، کیا ہوا، کیسے کہوں

❁

قتیلِ عشق جب جاں سے گزرتا ہے تو لکھتا ہوں
کوئی گہرے سمندر میں اترتا ہے تو لکھتا ہوں
دہکتی آگ کو گلزار بھی ہوتے ہوئے دیکھا
کوئی نمرود جب حد سے گزرتا ہے تو لکھتا ہوں
کھلا ہوں دامنِ صحرا میں خوشبو کون دیکھے گا؟
شکایت جب صبا سے پھول کرتا ہے تو لکھتا ہوں
خلوصِ دل سے ہوتے ہیں معطر ریشمی وعدے
اچانک جب کوئی ان سے مکرتا ہے تو لکھتا ہوں

جس معاشرے میں انصاف نہ ہو وہاں رہنا کسی جہاد سے کم نہیں

جو شاعری قاری اور سامع کے جذبات کو چھو نہ سکے، زندہ نہیں رہتی

امریکہ میں مقیم ممتاز شاعر

احمد ندیم رفیع

سے حسن عباسی کا خصوصی انٹرویو

میرے نزدیک باہمی محبت اور انسان دوستی کا پرچار سب سے بڑا نظریہ ہے

سوال: شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا۔ پہلے پہل کن شاعروں ادیبوں سے ملاقاتی ہوئی۔ پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟

جواب: شاعری کی طرف فطری میلان بھی تھا اور گھر کے ماحول نے بھی اس ذوق کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ میرے والد صاحب ملک رفیع الدین اور اردو زبان کے پروفیسر تھے۔ گھر میں اردو شعر و ادب کی کتابوں کی فراوانی تھی۔ سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں عامر فراز کے ساتھ مل کر شاعری کیا کرتا تھا۔ عامر فراز بعد میں حلقۂ اربابِ ذوق میں بہت فعال رہا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں مشکور حسین یاد اردو کے استاد تھے جن سے سیکھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں پروفیسر جعفر بلوچ سے بھی اپنی غزلوں کی اصلاح لی جو گورنمنٹ کالج ہی میں تعینات تھے۔ اسی کالج میں حامد یزدانی سے دوستی نے میرے ذوقِ شاعری کو مزید جلا بخشی۔ ایف ایس سی میں ایک طرحی مشاعرہ میں شرکت کی تو اس میں پہلا انعام ملا۔ صدرِ مشاعرہ سجاد باقر رضوی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر بہت شاباش دی اور خاص طور پر کہا کہ محنت کرتا رہا تو ایک دن اچھا شاعر بن پاؤں گا۔ ایف ایس سی کے بعد فارغ تھا تو ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا جس کے طفیل علمِ عروض سے آگاہی ہوئی۔ انہی دنوں غضنفر علی ندیم سے ملاقات ہوئی اور جب تک پاکستان میں رہا، باقاعدگی سے حلقۂ تصنیفِ ادب کی ہفتہ وار محفلوں میں شرکت کرتا رہا۔ ان محفلوں میں بہت سے لوگوں سے ملا اور بہت کچھ سیکھا۔ مرحوم اظہر جاوید صاحب کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ماہنامہ تخلیق میں میری ایک غزل شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میری شاعری قابلِ اشاعت ہے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں محمد یونس بٹ میرا ہم ذوق اور ہم جماعت تھا جس نے بعد میں مزاح نگاری میں بہت نام کمایا۔ ۱۹۸۲ء میں مرحوم امجد اسلام امجد ایک مشاعرے میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج تشریف لائے۔ ان کو اپنی شاعری سنائی تو انہوں نے کہا کہ وہ مجھے ایک خط لکھ کچھ مشورے دیں گے۔ اور

احمد ندیم قاسمی اور عامر فراز کے ساتھ

واقعی ان کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اگر اچھا شاعر بننا ہے تو اساتذہ اور مشاہیر کی شاعری کا مطالعہ اپنی ایک عادت بنالوں۔ انہوں نے ان شاعروں کی ایک فہرست بھی بنا کر بھیجی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان سے آئرلینڈ منتقل ہوگیا۔ سن ۲۰۰۰ء میں مجموعہ کلام شائع کروانے کا شوق چرایا۔ ایک مشترکہ دوست کے توسط سے فرحت عباس شاہ سے ملاقات ہوئی۔ پہلا شعری مجموعہ ''آنکھوں میں ستارے رہنے دے'' پبلشر 'شام کے بعد' کے بینر تلے شائع ہوا۔ اس کی تقریبِ رونمائی میں مرحوم عدیم ہاشمی، حسین مجروح اور اجمل نیازی مہمانانِ خصوصی تھی۔ عدیم ہاشمی نے ایک نجی محفل میں میری شاعری میں کچھ تکنیکی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔ جس سے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی کتاب شائع کرنے میں کچھ جلدی کردی ہے جبکہ ابھی مجھے بہت کچھ

پروین شاکر ادب میلہ میں کلام سناتے ہوئے

بھی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ اس لیے ان سب حضرات کا ذکر کرنا اور احسان ماننا ضروری سمجھا۔

سوال: شاعری آپ کی محبوبہ ہے یا وقت گزاری کا ذریعہ؟

جذبات کو فروغ ملتا ہے۔ عشق کا تجربہ انسان کو روحانی اور جذباتی طور پر بھی ترقی دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی، شفقت اور بے لوث محبت کا اظہار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جب کوئی محبت کے ساتھ کسی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے تو وہ زندگی کی سختیوں کو زیادہ بہادری اور مضبوطی کے ساتھ سہہ سکتا ہے۔ عشق اکثر تخلیقی اظہار کا ایک زبردست ذریعہ بنتا ہے۔ شاعری، موسیقی، فنون لطیفہ اور ادب میں عشق کے ایسے اظہار یے آئے دن آتے ہیں، جہاں فنکار اپنے جذبات کو تخلیقی طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ ہر انسان عشق کے تجربے سے گزرتا ہے۔ میں بھی گزرا اور اس تجربے نے میرے شاعری پر اثرات بھی چھوڑے ہوں گے۔

ہم فقیروں کو کیا غرض اس سے
کہ خزاں کی ہو یا بہار کی دھوپ

پروین شاکر کے بیٹے سید مراد علی کے ساتھ

پروین شاکر ادبی میلہ میں جاسم عامر کے ساتھ

کینیڈا کی معروف شاعرہ نسرین سید کے ساتھ

سیکھنا باقی ہے۔ سن ۲۰۰۲ء میں امریکہ منتقل ہوگیا اور تب سے یہیں مقیم ہوں۔ امریکہ آکر پہلے پانچ سال شاعری سے کنارہ کش رہا۔ انہی دنوں یاہو اور جی میل پر ادبی گروپ بننے شروع ہوئے تو گزرگاہِ خیال گروپ میں کسی نے شامل کر دیا۔ فیصل حنیف اس گروپ کے کرتا دھرتا تھے جو باقاعدگی سے اساتذہ کا کلام شیئر کرتے تھے۔ انہوں نے غالب فہمی کا سلسلہ بھی شروع کیا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ بزمِ اردو قطر سے افتخار راغب طرحی مشاعروں میں شرکت کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ اس طرح میری شاعری کا دوسرا جنم ہوا۔ ایک بار مشکل بحروں میں طبع آزمائی کا شوق چرایا تو مشکل سے مشکل بحر میں غزلیں لکھیں۔ جواب کچھ طویل ہوگیا لیکن کچھ لوگ ایسے نابغۂ روزگار ہوتے ہیں کہ ان سے ایک دن کی ملاقات

جواب: میرے نزدیک شاعری کو وقت گزاری بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ایک محبوبہ کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ میں شاعری کو تفریح، آرام یا ذہنی مشغولیت کا ایک ذریعہ بھی سمجھتا ہوں اور ایک زندہ، سانس لینے والے ساتھی کے طور پر بھی دیکھتا ہے جو سننے، سمجھنے اور جذبات کو بانٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سوال: عشق کس بلا کا نام ہے۔ کبھی سامنا ہوا؟

جواب: عشق انسانی زندگی میں ایک اہم اور کلیدی جذبہ ہے جو لوگوں کے درمیان گہرے اور معنی خیز روابط کو فروغ دیتا ہے۔ انسان کو اپنے بارے میں، اپنے جذبات اور احساسات کے بارے میں گہرائی سے جاننے کا موقع دیتا ہے، جس سے خود شناسی میں اضافی ہوتا ہے۔ عشق انسان کو بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے جس سے مثبت

ہم رہِ عشق کے مسافر ہیں
ہم پہ رہتی ہے کوئے یار کی دھوپ
سامنے ہجرِ یار کا صحرا
کوس در کوس انتظار کی دھوپ

سوال: آپ کے نزدیک اچھی شاعری کی تعریف کیا؟

جواب: شاعری ایک جامع فن ہے جو زبان، جذبات، فکر اور موسیقیت کے میل سے تخلیق ہوتی ہے اور یہ قاری یا سامع کو اپنے جادو میں جکڑ لیتی ہے۔ درحقیقت جو شاعری قاری یا سامع کے جذبات کو چھو نہ سکے، کبھی زندہ نہیں رہتی۔ اچھی شاعری، خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، ایک ایسا فن ہے جو زبان کی خوبصورت، اظہار کی گہرائی اور جذبات کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ علامتیں اور تصویری زبان شاعری کو تاثیر بخشتی ہیں۔ (بقیہ اندرونی صفحات پر)

اس شہرِ شب زدہ میں سدا اپنے خون سے ہر بام پر چراغ جلاتا رہا ہوں میں

غزلیں

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

فیصل آباد

ابھی کھلا نہیں بابِ تجلیات اے دل
بہت طویل ہے فرقت کی کالی رات اے دل
بس اک نگاہ میں سب شہرِ خواب خاک پہ تھا
کسی کی آنکھ کے دیکھے ہیں معجزات اے دل
کبھی کبھی تو یہ تصویرِ خانۂ دنیا
دکھائی دیتا ہے، نقشِ توہمات اے دل
خیالِ یار ہمہ وقت حرزِ جان رہا
تمام عمر گزاری ہے اس کے ساتھ اے دل
لہو لہو ہوئیں صدیوں کی انگلیاں لیکن
اسی طرح سے ہے عقدۂ کائنات اے دل
ابھی تو خوشبو ہواؤں میں اس کی ہے جعفرؔ
ابھی تو تھا مرے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ اے دل

کبھی گردِ وقت کو ٹال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
کبھی اپنی آنکھیں اجال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
ترے اترے اترے شباب سے مری خواہشیں کیوں گریز ہوں
یہ فریب ہیں مہ و سال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
جو مرے بدن میں مثالِ خون رواں دواں تیرا روپ ہے
لہو بام و در پہ اچھال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
وہی خواب خواب سی رہگزر وہی رنگ رنگ سی تتلیاں
وہی جھونکے بادِ شمال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے
پسِ آئینہ یوں کھڑا رہے تیرا حسن جیسے سراب ہو
کبھی آئینوں سے نکال کے تجھے دیکھنے کا خیال ہے

زیرِ ستم ہے کون کہاں کچھ خبر نہیں
برپا ہے کس کی آہ و فغاں کچھ خبر نہیں
یہ آگ جانے کس کے نگر ہے لگی ہوئی
اٹھتا ہے کس نگر سے دھواں کچھ خبر نہیں
بارش سی ایک خون کی جاری ہے ان دنوں
ہے یہ بہار یا کہ خزاں کچھ خبر نہیں
بکھری ہوئی ہیں جابجا ہر سمت کرچیاں
ٹوٹا ہے کون شیشہ گراں، کچھ خبر نہیں
رہتی ہے دل کی دل میں ہی اکثر ہر ایک بات
کب دے گی دل کا ساتھ زباں کچھ خبر نہیں
منسوب ہر کسی سے ہیں دسیوں کہانیاں
ہوگا کسی کا کیسے بیاں کچھ خبر نہیں
اتنا ہے بس کہ راستے پر گامزن ہیں ہم
لیکن ہیں کس طرف کو رواں کچھ خبر نہیں
دیکھو جدھر ہے اُس طرف بھگدڑ مچی ہوئی
محوِ ستم ہے کون کہاں کچھ خبر نہیں
جعفرؔ کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہیں ہم
رہتے ہیں ہم وہاں کہ جہاں کچھ خبر نہیں

کانٹوں پہ چل کے پھول کھلاتا رہا ہوں میں
سنت کسی کی یوں بھی نبھاتا رہا ہوں میں
سوئے ہوئے ضمیر جگاتا رہا ہوں میں
ہر دم صدائے صبح لگاتا رہا ہوں میں
ان نو شگفتہ کلیوں پہ سانپوں کی ہے نظر
یہ راز باغباں کو بتاتا رہا ہوں میں
اس شہرِ شب زدہ میں سدا اپنے خون سے
ہر بام پر چراغ جلاتا رہا ہوں میں
جعفرؔ میں دشمنوں سے بھی کرتا رہا ہوں پیار
اور دوستوں سے زخم بھی کھاتا رہا ہوں میں

کسی آمر کا بھی دِیدے میں ڈر نہیں
یہی عادت ہے تو شانوں پہ سر نہیں
اسے کھونا تو ہے یکسر خسارہ
اسے پانا بھی خالی از خطر نہیں
تو پھر یہ مختصر سی کیوں ہے ہستی
اگر یہ زندگی بارِ دگر نہیں
یہ کس بے عشق بستی سے گزر ہے
کوئی کوچہ یہاں زیر و زبر نہیں
نئی شمعوں کے جلنے پر نہ خوش ہو
تری جعفرؔ پتنگوں پر نظر نہیں

لمحہ آیا نہ کوئی چین کا اُس رات کے بعد
تشنگی اور بڑھی موسمِ برسات کے بعد
کیا ہے جو اُس کو نہ توفیق ہوئی آنے کی
یاد تو آتی رہی ترکِ ملاقات کے بعد
دشمن آئے ہیں مداوائے غمِ جاں کرنے
یہی باقی تھا ستم، گردشِ حالات کے بعد
دھوپ میں گیسوئے محبوب کی یاد آئی ہے
رات کی رانی مہکنے لگی ہے رات کے بعد

جس کے سبب ان کا کلام بعض ہم عصر شعراء سے مختلف اور منفرد انداز اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے آدابِ نعت کے ساتھ ساتھ عقیدت کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ تخلیقی ریاضت کے عمل میں ایک عمر گزارنے کے بعد اب نعت گوئی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، جیسا کہ وہ خود کتاب کے پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ ''ربِ کائنات نے مجھے دیگر اصنافِ سخن، منقبت، غزل و نظم کے میدان میں بھی کامیابی بخشی مگر میرا فخر و ناز صرف اور صرف نعتِ مصطفیٰ ہی ٹھہرتی ہے''۔

یہاں ریاض ندیم نیازی کی نعتیہ توفیقات اور مرزا غالب کی زمینوں میں ان کی فنی ہنرکاری کے اعتراف کے طور پر ان کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

مست ہو جاتا ہے عشقِ مصطفیٰ سے جس کا دل
کھیل ہو جاتا ہے اس کو لانا جُوئے شِیر کا

کبھی مضطرب نہ ہوتا، نہ مَیں اشکبار ہوتا
میں اگر مدینے جاتا تو مجھے قرار ہوتا

لے کے آئے گا مدینے سے بُلاوا اِک دن
میری خاموش تمنا کا دُعا ہو جانا

کاش میں زندہ رہوں محوِ سفر ہونے تک
میں پہنچ جاؤں مدینے میں سحر ہونے تک

بن جائے میرا کام، جو اِک نعت بھی مری
مقبول ہو نگاہِ رسالت مآب میں

مَیں پیروی شاہؐ میں ہوں بوریا نشیں
پھر بھی کسی امیر سے کمتر نہیں ہوں مَیں

ہے نعت ندیم آج یہ غالب کی زمیں میں
اندازِ بیاں اُس کا اِن اشعار میں آوے

یہ انتہائی خوبصورت نعتیہ مجموعہ روایتی آب و تاب اور عمدہ سفید کاغذ کے ساتھ معروف شاعر اور ناشر خالد شریف کے ادارے مادرا پبلشرز سے شائع ہوا ہے اور صد شکر کہ خالد شریف کی شاعرانہ صلاحیت کے سبب اس میں کوئی کمپوزنگ کی غلطی داخل نہیں ہو سکی۔

تخلیق ایوارڈ

تحریر: سونان اظہر

ماہنامہ 'تخلیق' نے اپنے اشاعتی تسلسل سے شعروادب کے فروغ میں جو حصہ ڈالا ہے، اب وہ کسی سے پنہاں نہیں رہا - اس جریدے کا دوسرا دور کچھ امتیازات قائم کرنے میں بحمداللہ کامیاب رہا! ان میں نمایاں 'تخلیق ایوارڈ' کا اجرا قرار پائے گا - اس ایک عشرے سے زاید عرصے میں قد آور ادبی شخصیات کا اعتراف کرتے ہوئے، ان کی خدمت میں مذکورہ ایوارڈ پیش کیا گیا - گیارہ ایوارڈز کا کریڈٹ گزشتہ برسوں کا حاصل ہے - اس سال جیوری کے فیصلے کو سامنے رکھتے ہوئے بارھواں ایوارڈ جناب نسیم سحر کے نام ہوا - روایت کے مطابق 'تخلیق' نے اس پس منظر میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا - جس میں ایک سو سے زاید ممتاز علمی ادبی احباب نے شرکت کی - درحقیقت یہ تقریب ملاقات کا ایک بہانہ ہے، متعدد اصحاب قلم کا بلاواسطہ ملنا اس لیے اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے کہ سوشل میڈیا نے فرد کے شخصی وجود کو منہا کر ڈالا ہے - اب رابطہ ہو جانے ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے - واقعہ یہ ہے اس صورت حال نے رشتوں کو کمزور کیا ہے - یوں ایک چھت کے نیچے اپنے ہم مزاجوں سے بالمشافہہ ملاقات کا کوئی نعم البدل نہیں - حالیہ تقریب میں لاہور میں مقیم دوست یقیناً" کثرت میں تھے مگر پنجاب بلکہ ملک کے دور دراز شہروں میں رہنے والے مکرمین کی تشریف آوری بھی سب نے دیکھی - 'تخلیق' کے بانی مدیر اظہر جاوید سے ذاتی تعلق رکھنے والوں نے انھیں بہت جذبے سے یاد کیا! ان پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھنے والے فیصل شہزاد سے لے کر اظہر جاوید کا کلام پیش کرنے والے عدیل برکی اور شوکت علی (مرحوم) کے صاحب زادے امیر شوکت علی خاص طور پر حاضرین کی توجہ کا مرکز بنے - اس رنگا رنگ بیٹھک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صحافت، انتظامی امور، شعبہ تدریس سمیت کئی طبقات کے نمایندے شریک تھے - تاہم 'تخلیق' کا مرکزہ چونکہ شروع سے 'ادب' ہے اس لیے یہ بھرپور نشست مجموعی طور پر ادبی ہی ٹھیرے گی -

میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اظہر جاوید کی مناسبت سے مجھے سینیر ادبا و شعرا سے فیاضانہ شاباش ملی اور ہم عمروں کی طرف سے سچا اعتراف نصیب ہوا - 'تخلیق' کو جاری رکھنا ایسا سہل تو نہیں مگر شرکا کی حوصلہ افزائی نے میری جہد کو باثمر کر دیا ہے - سب موجودگان کی محبتوں کا مقروض ہوں کہ وہ آج کے مصروف عہد میں اپنا قیمتی وقت نکال کر میری خوشی میں شامل ہوئے - سب کا شکرگزار ہوں! خاص طور پر ان دوستوں کا ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر خواجہ زکریا، نسیم سحر، خالد اقبال یاسر، نزیر قیصر، مجیب الرحمٰن شامی، عرفان اظہر، نوید چوہدری، خرم پاشاہ، خاور نعیم ہاشمی، ڈاکٹر طارف شریف پیرزادہ، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، کاشف منظور، خالد شریف، ایوب غوری، جبار مرزا، حمید رازی، اشرف جاوید، شاہد علی خان، میجر شہزاد نیر، ریاض حسین زیدی، شہزاد روشن گلانی، پیر ضیاء الحق نقشبندی، پروفیسر اعتبار ساجد، فرید پراچہ، امیر بہادر ہوتی، خواجہ سرفراز، بیدار سرمدی، ڈاکٹر یونس خیال، ڈاکٹر محمد رفیق، توقیر شریفی، ڈاکٹر ایوب ندیم، ڈاکٹر غافر شہزاد، ڈاکٹر جواز جعفری ڈاکٹر اشفاق ورک، ڈاکٹر عبدالکریم، جمیل احمد عدیل، ڈاکٹر افتخار بخاری، حفیظ طاہر، سلیم شہزاد، ممتاز راشد لاہوری، فیصل شہزاد، سحر حفیظ، تسنیم کوثر، فرحت پروین، بینا گوھندی، نوین روما، فائزہ بخاری، سلمی اعوان، بلقیس رضا، خالد محمود، صوفیہ بیدار، غلام حسین ساجد، نواز کھرل، عایشہ مسعود، حسن عسکری کاظمی، شفیق احمد فاروقی، شمشیلہ سعید، رضوان بٹ، حسن عباسی، سعدیہ سونان، فرحت عباس شاہ اور بہت سے دوستوں نے شرکت کی سب دوستوں کی تشریف آوری کا اور تقریب کو کامیاب بنانے کا ادارہ تخلیق دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہے۔

مدیر تخلیق

میں کہاں جسم و جاں چلاتا ہوں
چل رہی ہے زباں چلاتا ہوں
اپنی صورت کبھی نہیں دیکھی
آئنوں کی دکاں چلاتا ہوں
عشق سکہ ہے میری مٹھی کا
دیکھئے کب کہاں چلاتا ہوں
جب مجھے آسماں ہلانا ہو
آنکھ کی پتلیاں چلاتا ہوں
دست و بازو مرے سلامت رکھ
میں ترے دو جہاں چلاتا ہوں
وقت اُلٹا چلاتا ہوں فیصلؔ
خواب کے درمیاں چلاتا ہوں

ادب آداب کا قرینہ سمجھ
میرے جھکنے کو عاجزی نہ سمجھ
ڈوبنے سے بچا رہا ہے تجھے
اسی تختے کو اب سفینہ سمجھ
اپنی میّت پہ رو رہا ہوں میں
سینہ کوبی کو شاعری نہ سمجھ
ایک بہروپ یہ بھی ہے اس کا
غم کی ناگن کو جل پری نہ سمجھ
ان میں کچھ رحم کھانے والے ہیں
سب درندوں کو آدمی نہ سمجھ
زندہ درگور کر کے چھوڑے گی
نامرادی کو عارضی نہ سمجھ
کتنے سانپوں نے گھیر رکھا ہے
اپنے درویش کو خزینہ سمجھ
یہ جو بنیاد میں نمی سی ہے
اس کو دیوار کا پسینہ سمجھ
دل کے اندر خدائی رہتی ہے
اس کو مکہ سمجھ مدینہ سمجھ

گزری ہے ساری عمر کسی خواب کے بغیر
یہ نامراد ہنس ہے تالاب کے بغیر
پیڑوں سے گفتگو نہ کروں تو کروں بھی کیا
آوارگی عذاب ہے احباب کے بغیر
اس بے گھری میں تازہ ہوا تو فراواں ہے
میں کھل کے سانس لیتا ہوں اسباب کے بغیر
حیران ہو کے سنتا ہوں دھڑکن کی ہاؤ ہو
یہ ساز بجتا رہتا ہے مضراب کے بغیر
آبِ رواں ہے کیا جو کناروں میں قید ہے
دریا کو کون پوچھے گا سیلاب کے بغیر
مایوسیوں نے ذہن کو پتھرا کے رکھ دیا
کرنا ہے حوصلہ مجھے اعصاب کے بغیر
ہے خاک داں پہ دھوپ کا احسان دائمی
ہر رات ورنہ ہونی تھی مہتاب کے بغیر

آنکھیں نیند سے عاری کرتا رہتا ہوں
خوابوں سے غداری کرتا رہتا ہوں
وقت مری تعمیر گراتا رہتا ہے
میں اس کی مسماری کرتا رہتا ہوں
زد میں آ جاتا ہے بچ بھی جاتا ہے
وار نفس پر کاری کرتا رہتا ہوں
کانٹوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے
زخموں پر گلکاری کرتا رہتا ہوں
ٹکڑے بھر کر اس میں اپنے خوابوں کے
خالی جیب کو بھاری کرتا رہتا ہوں
دستک دے کر اپنے ہی دروازے پر
اپنی دل آزاری کرتا رہتا ہوں
سب کو چھوڑ کے ایک سفر پر جانا ہے
جانے کی تیاری کرتا رہتا ہوں

جسم کہنے لگا کوچ یا تخلیہ
روح کہنے لگی تخلیہ تخلیہ
عشق نے کیسے کیسے تحائف دیے
ایک آوارگی ، دوسرا تخلیہ
تخلیہ تو ہے خوابوں کی نوحہ گری
اور پھر ہجر کی رات کا تخلیہ
تخلیہ دو جہاں سے سرِ راہ کر
بے حسی اوڑھ لے، ہو گیا تخلیہ
جس کو دیکھو خود اپنا گرفتار ہے
کیا مرا تخلیہ کیا ترا تخلیہ
کوئی دروازہ دستک سے کُھلتا نہیں
سب پہ لکھا ہے بہرِ خدا تخلیہ

کروں کلام تو ہر بے زباں کلام کرے
زمیں کلام کرے آسماں کلام کرے
کلام کرتا ہوں میں بے ثبات ہستی سے
کسی چراغ سے جیسے دھواں کلام کرے
وہاں بھی حفظ مراتب کی بات کی میں نے
جہاں مکین سے پہلے مکاں کلام کرے
کلام کرتی ہے کچھ ایسے زندگی مجھ سے
کہ جیسے سر پھرے بچے سے ماں کلام کرے
خموش ہوں میں پرندوں کی شاعری سُن کر
اب ان کے بعد کوئی کیا میاں کلام کرے

شاہد ماکلی/ لاہور

وسعتِ افلاک میں پھیلا ہے دھارا شام کا
شامِ ہجراں سے بھی آگے ہے کنارا شام کا
شب نوردوں پر گراں گزرے گا جنگل کا سفر
آج ڈوبا شام سے پہلے ستارہ شام کا
روز آنکھوں میں سپردِ خواب ہوتا آفتاب
روز پلکوں پر اُترتا ہے نظارہ شام کا
جب بھی ہم نے عالمِ وحشت میں دیکھا ہے اسے
مل گیا اس کی نگاہوں سے اشارہ شام کا
جسم و جاں روشن ہیں جس کے جلوۂ خوش رنگ سے
کس نے آخر چہرۂ تیرہ سنوارا شام کا
وہ بھلا سورج نکلنے کی دعائیں کیوں کرے
جس کے آنگن میں بھی اُترا ہو ستارہ شام کا
آج اس کی دسترس میں کوئی جگنو بھی نہیں
آج شاہدؔ کس طرح ہوگا گزارا شام کا

سمندر کی مسافت میں کنارا ڈوب جائے گا
جہاں طوفان آئے گا، سہارا ڈوب جائے گا
وہ جب ملنے کو آئے گا تو آنکھیں نم نہیں ہوں گی
اگر سورج نکل آیا، ستارہ ڈوب جائے گا
مجھے قوسِ قزح کے رنگ کچھ تو دیکھ لینے دو
ذرا سی دیر میں منظر دوبارہ ڈوب جائے گا
مجھے تم بے سرو سامان کر کے دیکھ لو لیکن
اسی سیلاب میں سب کچھ تمہارا ڈوب جائے گا
کہاں تک سوچ کے ساحل پہ دیواریں اُٹھائیں ہم
ہمیں معلوم ہے، یہ گھر ہمارا ڈوب جائے گا
سمندر ہے بہت بپھرا ہوا کل رات سے شاہدؔ
سفر سے روک لو اس کو خدارا، ڈوب جائے گا

تجھے ملوں گا میں فطرت کے استعاروں میں
تو اپنے حُسن کی تابانیوں میں دیکھ مجھے
نہیں، تو دشت کی ویرانیوں میں دیکھ مجھے
تجھے ملوں گا میں فطرت کے استعاروں میں
ازل سے بہتے ہوئے پانیوں میں دیکھ مجھے
مجھے نہ ڈھونڈ گزشتہ دنوں کے محبس میں
جمالِ نو کی گُل افشانیوں میں دیکھ مجھے
جگر کا درد سماتا ہے لفظ میں کیسے
پسِ فراق غزل خوانیوں میں دیکھ مجھے
کسی ستارے کی ضو میں نمود ہے میری
اُداس شام کی ویرانیوں میں دیکھ مجھے
مرا طلسمِ تحیر ابھی نہیں ٹوٹا
مرے خدا! مری حیرانیوں میں دیکھ مجھے
میں اپنے آپ پہ ہوں کس قدر گراں شاہدؔ
شعورِ ذات کی ارزانیوں میں دیکھ مجھے

ادائے خاص سے موسم کا لطف عام رہا
زمانہ مجھ سے، میں خوشبو سے ہم کلام رہا
کئی جہان تھے ہجر و وصال سے آگے
سرائے درد میں کچھ دن مرا قیام رہا
مرے نصیب کی شمعیں فلک پہ جلتی رہیں
زمیں کا خواب ہمیشہ سے تشنہ کام رہا
قدم قدم پہ میسر تھے سیمگوں جلوے
ہمارے پیشِ نظر اک وصالِ خام رہا
میں اپنی ذات کا ہوں آپ مقتدی شاہدؔ
مرا شعور مری فکر کا امام رہا

ازل سے بہتے ہوئے پانیوں میں دیکھ مجھے
قبول ہو نہ ہو، لیکن دعا تو کر جاؤں
تجھے سمیٹ نہ پاؤں تو خود بکھر جاؤں
بہت سے لوگ وہاں میرے منتظر ہوں گے
میں تیری قید سے نکلوں تو اپنے گھر جاؤں
کسی کی یاد میں جی بھر کے جی رہا ہوں میں
خدا کرے، اسی آسودگی میں مر جاؤں
کسی کا نقشِ قدم ساتھ ساتھ ہے میرے
میں دشت و کوہ و دمن میں جدھر جدھر جاؤں
میں کینوس پہ اُبھاروں گا نقشِ نو شاہدؔ
بس ایک لمحۂ تخلیق سے گزر جاؤں

بچھڑ کے تجھ سے گزارے جتنے بھی سال سائیں
ہمیں تو پل پل رہا ہے تیرا خیال سائیں
ابھی تو موسم بھی تجھ کو اپنا خراج دیں گے
ابھی تو نکھرے گا اور تیرا جمال سائیں
وہ بولتا ہے تو رس سماعت میں گھولتا ہے
وہ گفتگو میں ہے آپ اپنی مثال سائیں
ہماری راتوں میں کوئی روشن دیا نہیں ہے
ہماری جانب کوئی ستارہ اُچھال سائیں
ہم اپنے خوابوں کی کربلا میں سلگ رہے ہیں
جو ہو سکے تو ہمیں یہاں سے نکال سائیں
یہ آگ ہم کو کہیں جلا کر نہ راکھ کر دے
کہ آنچ دینے لگا ہے تیرا وصال سائیں
یہی بہت ہے کہ تیری چاہت میں دربدر ہیں
ہمیں کسی اور امتحاں میں نہ ڈال سائیں

ایک میں پانچ

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' جیسا پُر اثر جملہ تو آپ نے سینکڑوں بار سن رکھا ہوگا مگر'' ایک میں پانچ'' یقیناً نہیں سنا ہوگا۔ چلیں آج ایک میں پانچ بھی نہ صرف سُن لیں بلکہ یقین کر لیں۔ یہ جملہ میں کسی پراڈکٹ کی تشہیر یا کمپنی کی مشہوری کے لیے استعمال نہیں کر رہا بلکہ قارئین کرام! ایک ایسی کتاب کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ جسے جو جو احباب پڑھ چکے ہیں وہ تو میری تائید کریں گے اور جن تک ابھی یہ نسخہ نہیں پہنچ پایا، امید واثق کی جا سکتی ہے کہ وہ اسے حاصل کرنے اور پڑھنے کی خواہش ضرور رکھیں گے۔ یوں تو یہ کتاب ایک سفرنامہ ہے جس کا نام ہے'' یہ ہے لندن'' مگر اس کے مصنف ،جناب فقیراللہ خاں صاحب نے اپنے قلم کا رخ کچھ اسطرح استوار کیے رکھا کہ سفرنامے کے لوازمات بھی پورے کیے جائیں اور کسی بھی کتاب کے لکھے جانے کا بڑا مقصد(جو کہ پڑھنے والوں کو نئی معلومات، علم، آگہی یا کسی منطق اور فلسفے کی تفہیمی فضا کی سہولیات فراہم کرنا ہوتا ہے) بھی پورا کیا جائے۔ شاید اسی لیے جناب فقیراللہ خاں اس حوالے سے ایک کامیاب مصنف کے طور پر نہ صرف آج کی ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں بلکہ آنے والے وقت میں بھی ان کی جملہ تصنیفات اہل ذوق قارئین کی علمی پیاس بجھانے اور مفید معلومات فراہم کرنے کا کام کرتی رہیں گی۔ ان شاءاللہ۔

''یہ ہے لندن'' پیارے دوست اور ادب و ادیب کے محسن ،جناب حسن عباسی کے توسط سے موصول ہوئی، ویسے تو دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل نثری کتاب ایک دو نشستوں میں پڑھنا اتنا آسان نہیں سمجھا جاتا مگر سیانے کہتے ہیں کہ''الفاظ بولتے ہیں'' جی ہاں میں سمجھتا ہوں کہ الفاظ نہ صرف بولتے ہیں بلکہ توجہ اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں۔ یہ کتاب بطور سفرنامہ پڑھنے کی ابتدا کی تو الفاظ نے کہا کہ'' بابو جی دھیرے چلنا'' کیونکہ یہ کتاب محض ایک سفرنامہ نہیں جو کہ کسی قاری کو جلدی جلدی آگے پڑھنے کا موقع دے دے۔ چنانچہ الفاظ کی مرضی پر چلے تو ایک شماریاتی ادارے میں اپنی ابتدائی ملازمت کے شب و روز کی یاد تازہ ہوگئی، دو تین چیپٹر اور پڑھنے پر ڈاکٹر حمیدالدین اور محمد دین فوق کی تاریخ نگاری یاداشت کے نہاں خانوں سے نکل کر ایکٹو شعور کی دہلیز تک آ پہنچی۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر زبان و بیاں کی پر کاری اور انداز تحریر نے اساتذہ کی طرف توجہ دلانی شروع کر دی۔ الغرض کتاب کا مطالعہ اختتام پذیر ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے تو اس ایک کتاب میں پانچ کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ اب اگر ان کا مختصر انفرادی تذکرہ کروں تو یوں ہونا چاہیے:

ا۔لندن کا جغرافیہ:

جناب فقیراللہ خاں نے اس سفرنامے میں لندن شہر اور اس میں واقع تمام اہم مقامات جن میں، شاہی محلات، ادارے، سڑکیں، شاہرات، پُل، باغات، تفریحی مقامات، سرکاری عمارات، عجائب گھر، تعلیمی ادارے، پارکس، انڈر گراؤنڈ ریلوے، بس سٹاپ، دریا، دریاوں پر تعمیر شدہ پل، اہم سٹریٹس، ٹاو رز اور گرجا گھر شامل ہیں اور ان کے علاوہ رہی شاید ہی کوئی اہم جگہ ایسی ہو جس کا محلِ وقوع، رقبہ، فاصلاتی پیمائش اور ہر طرح کی جغرافیائی معلومات اور اہمیت کا تفصیلی تذکرہ نہ کیا ہو۔ یوں لگتا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو کسی ایک مرکزی مقام پر رکھ کر پورے لندن اور اسکے جملہ مقامات کا نہ صرف محل وقوع جان سکتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر پورے شہر کا نقشہ اس کتاب کو سامنے رکھ کر کسی کاغذ پر بنا سکتا ہے۔

۲۔لندن تاریخ کے آئینے میں:

مصنف نے جہاں لندن کا جغرافیہ پیش کیا ہے وہیں اسکی تاریخ کے اہم نکات پر بھی سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ جن میں تمام محلات کی تاریخی اہمیت ان کی ابتدا، بنانے والے کا نام، تعمیر کا زمانہ، اور پھر آرکیٹیکٹ تک کا نام بلکہ جس جس کا نام تبدیل کیا گیا اس کی تفصیل تک بھی مہیا کی ہے۔ یہی نہیں، لنڈن میں رونما ہونے والے دیگر تاریخی واقعات جن میں لنڈن میں۔ ۱۶۶۵ء میں پھیلنے والی طاعون کی وبا (گریٹ پلیگ) اور اسکے ایک ہی سال بعد کی ہولناک آگ۔ گریٹ فائیر۔ اور اسکے مضمرات، جنگِ عظیم اول اور دوئم کی تباہ کاریاں، دوسری جنگ عظیم میں فتوحات کا تذکرہ، جنگی ہیروز اور انکے کارناموں کا اجمالی خاکہ، ان کے لیے شاہی اعزازات کی تفصیل ، برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (دارالعوام اور دارالامراء) کی ابتدا تاریخی اہمیت ، بگ بن (کلارک ٹاور)، سینٹ پال کیتھیڈرل، ویسٹ منسٹر ایبے، سٹی آف ویسٹ منسٹر، بکنگھم پیلس، دی مال، کنسنگٹن پیلس، ٹن ڈاؤننگ سٹریٹ، اوول اور لارڈز جیسے کرکٹ گراؤنڈ، لندن سنٹرل مسجد، کیبل کار، ملینیم ڈوم، بی بی سی، لارڈز میں کرکٹ ورلڈ ریکارڈز،

لندن کے اخبارات، ملکہ وکٹوریہ اور اس کے برصغیری استاد منشی عبدالکریم اور اسکا خاندانی تعارف، ملکہ کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں اور اعزازت کا واپس لے لینا، غرضیکہ مصنف نے اس سفرنامے میں قاری کو وہ وہ تاریخی معلومات فراہم کی ہیں جن کے لیئے یہاں بیٹھے ہوئے کسی بڑی سے بڑی لائبریری میں بھی تلاش کریں تو متعدد کتابیں اور بیش بہا وقت درکار ہو۔ پھر بھی شاید اتنی تاریخی معلومات پورے طریقے سے حاصل نہ ہونے پائیں۔ یہ الگ بات کہ ان تاریخی معلومات کے حصول میں جناب فقیراللہ خاں نے کیا کیا مشکلات نہیں اُٹھائی ہونگی۔

۳۔لندن: اعداد وشمار کے آئینے میں:

جناب فقیراللہ خاں نے لندن میں تعمیر شدہ شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے محلات کی عمر، وجہ تسمیہ، ان کی تعمیر پر اُٹھنے والے اخراجات، انکی تزئین وآرائش کی تفصیل، ان کے نگران شاہی کارندے، انکا لباس اور انکے مشاہروں پر اُٹھنے والے اخراجات کی تفصیل، دریا اور دریاوں کی لمبائی، چوڑائی، منبع ومقطع، بہنے کی سمت، مختلف مقامات پر چوڑائی اور گہرائی، ان پر تعمیر شدہ پُل ان کے نام، مقام اور ان کی لاگت، باغات کے نام، رقبہ، ان کو کور کرنے والے ٹیوب، ریلوے اور بس سٹاپ، کالج، یونیورسٹیاں ان میں زیرِ تعلیم طلبا کی تعداد، تعمیر کرنے والوں کی تعداد، اُٹھنے والے اخراجات کی تفصیل، ایوان پارلیمنٹ، ادارے، روڈ، شاہراہیں، انکی تعداد۔ لمبائی، چوڑائی، ناگہانی آفات کی تعداد، ان میں چلے جانے والوں کی تعداد، نقصانات کا اندازہ، چڑیا گھروں کی تعداد، رقبہ، سیاحوں کی تعداد، اوول اور لارڈز میدانوں میں کھلے جانے والوں میچوں اور ریکارڈز کی تعداد غرضیکہ لندن کا پورا سٹیٹس ٹیکل ڈیٹا اس سفرنامے میں فراہم کر کے ایک گزیٹیئر کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ جو کہ صاحب کتاب کی عمدہ کاوش اور ہمت کا ثبوت ہے۔

۴۔حسنِ فطرت کی عکاسی:

جنابِ فقیراللہ خاں کا زورِ قلم ان کی تحریروں کا لطف اس وقت اور بھی بڑھا دیتا ہے جس وقت وہ قدرتی مناظر پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں، تو اس پر اتنے انہماک سے لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی منظر کا ناظر خیال کرتا ہے۔ اور اس منظر سے اتنا ہی محظوظ ہوا چاہتا ہے جتنا کہ عملی طور پر دیکھنے والا۔ ان کی اس منظر کشی کی بیسیوں مثالیں اس سفرنامے میں موجود ہیں۔ بس ان میں سے صرف ایک ''دی مال'' پر لکھا ایک پیراگراف دیکھیئے:

''دی مال وسطی لندن کے شہر ویسٹ منسٹر میں واقع ایک مشہور ومعروف سڑک کا نام ہے۔ یہ ایک طرح کی وی آئی پی سڑک ہے۔ یہ سڑک شاہ برطانیہ کی سرکاری رہائش گاہ، بکنگھم پیلس کے سامنے وکٹوریہ میموریل سے شروع ہو کر ٹرافالگر اسکوائر تک جاتی ہے۔ یہ ہے تو ایک چھوٹی سی سڑک لیکن سارے لندن شہر میں اس کی اپنی شان اور خاص پہچان ہے۔ یہ سڑک عام سڑکوں جیسی نہیں بلکہ اس کا فرش ریڈ کارپٹ کی طرح سرخ رنگ کا ہے کیونکہ یہی سڑک نہ صرف شاہوں بلکہ ملکہ عالیہ اور دوسرے ممالک کے سربراہان کو جب بکنگھم پیلس میں اعزاز کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے تو اسی مال پر شاہی بگھی میں بیٹھ کر شاہی محل میں داخل ہوتے ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف جب برطانیہ کے یونین جیک اور آنے والے سربراہ کے ملک کے جھنڈے لہراتے ہیں تو بہت خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ دی مال کے دائیں بائیں ایستادہ درخت عجب بہار دکھاتے ہیں۔''

۵۔لندن پر تحقیقی کام:

اس سفرنامے میں مصنف کی تحقیقی کاوش کو علمی و ادبی کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ انھوں نے اپنے اس سفرنامے میں جو سفری مشاہدات پیش کیے ہیں وہ تو اپنی جگہ اپنے وجود اور اہمیت کے عامل ہیں ہی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جو اعداد وشمار اور تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایک مشکل ترین کام ہے جس کے لیے مصنف کا ان معلومات کو حاصل کرنے تک کا سفر اس سفر نامے کی کتابی صورت میں لانے سے کہیں زیادہ کٹھن اور دشوار ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر وہ ان معلومات کا کتابی حوالہ بھی ساتھ دے دیتے تو یہ سفرنامہ ایک تحقیقی مقالے کی حیثیت سے لندن پر اپنی نوعیت کا ایک مستحکم مستند اور منفرد تحقیقی مقالہ ہوتا۔ یہاں ہمیں مصنف کی علمی سوچ اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ سفرنامہ محض اپنے نام ونمود اور اپنی کتابوں کی تعداد میں اضافہ دکھانے کیلئے نہیں لکھا بلکہ ان کی یہ کاوش بذاتِ خود باور کراتی ہے کہ اس کے پیچھے ان کی عالمانہ سوچ اور بالیدہ فکر کارفرما ہے۔ جو کچھ ایسا کر گذرنے کا تقاضا کرتی ہے کہ آئندگان جس سے مستفید بھی ہوں اور رہنمائی بھی حاصل کرسکیں۔ یقیناً یہ کتاب لندن کے حوالے سے ایک انتہائی اہم اور معلوماتی دستاویز کی صورت میں اہل علم ودانش کی توجہ کا مرکز رہے گی۔

ابنِ بطوطہ کا بھائی

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

اگر یہ بزرگوں کی روایت کو ساتھ لے کے چلتے تو آج ان کا نام ہوتا: ڈاکٹر پروفیسر نجیب عبدالمجید جمال الدین دہلوی، ثُم لائلپوری، ثُم ملتانی، ثُم بہاولپوری، ثُم الازہری، ثُم اسلام آبادی، ہذا ثُم بچنگوی فی الحال اور آخری ثُم لاہوری۔ اس کے بعد پورے ملکمیں بچے بچے کی زبان پر ہوتا کہ ان حضرت نے اپنی دربدری کی بنا پر بڑا نام پایا ہے۔ گھر والوں نے نجیب الدین جمال نام رکھا تھا، نجیب کو جمال کے قریب کرنے کے لیے دین کو دائیں بائیں کر رکھا ہے۔

ان کے ماضی قریب و بعید پہ سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو ہم نہایت سہولت سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں زبان کی تہذیب و ترتیب دہلی سے، شوخی و شوخ چشمی لکھنوی سسرال سے، نام اور شخصیت کا حسن دادا جمال دین سے، جگت کی للک لائلپور سے، لہجے اور لارے لپے میں سوہن حلوے اور چونسے آم کی مٹھاس ملتان سے (ویسے ملتان بھی کیسا شہر ہے کہ م سے شروع ہو کے ن پہ ختم ہو جاتا ہے، بیچ میں اکلوتی تان ہے جو کبھی ایک چیز پہ ٹوٹتی ہی نہیں) ریاست کا رچاؤ بہاول پور کے قیام سے، جلدی ہاتھ نہ آنے کا ہنر اسلام آباد سے، کثرتِ اولاد کا ہُوکا اور شخصیت میں ڈراما کاری کا عنصر، اداکاری کے شوقین والدِ ماجد عبدالمجید سے، اور ان تمام صفات کو بروقت استعمال کرنے کا سلیقہ شہروں کے گُرو لاہور سے سیکھا ہے۔ عمر کی سات دہائیاں سوچ سمجھ کے گزار چکے ہیں، آج بھی ہفتے کے ساتوں دن مصروف رہتے ہیں۔ بیوی سے اتنا ہی ڈرتے ہیں، جتنا ہر شریف آدمی کے ڈرنے کا حق ہے۔ پاک امریکا تعلقات کے نشیب و فراز پہ شبلی فراز سے بھی گہری نظر ان کی ہے، ایسی نظر کسی اور کی ہو بھی نہیں سکتی، کیونکہ ان کے آدھے بچے امریکا میں اور آدھے پاکستان میں ہیں۔ ترقی پسندوں کے فرقۂ تغیر پسند سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھلے وقتوں میں خود پہ مسلط کی گئی پیپلز پارٹی کی محبت کو شریف بہو بیٹیوں کی طرح سر دے سائیں کی عدم دستیابی کے باوجود بھی نبھائے چلے جا رہے ہیں۔

اکلوتی ماؤں پہ گزارا کرنے والے مسکین صفت سن لیں کہ ان کی پہلی والدہ کا نام نواب بیگم، تعلق حُسن پور سے اور والد کا حُسن پرستی سے تھا۔ دوسری اماں جی بہ موسوم قیصر جہاں..... گویا نام نہاد شاہی و جہاں بینی و جہاں بانی تو ان کے خاندان میں زوج در زوج چلی آئی ہے۔ ایک بات کا خاص دھیان رہے کہ موصوف کی دونوں والداؤں اور بیوی کا تعلق سید گھرانے سے تھا اور ہے، ان کے اب تک سید نہ کہلوانے کا سبب ان کی خانگی معاملات میں عدم دلچسپی یا سُستی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ والد موصوف کی والدہ موصوفہ سے پہلی اور شدید محبت کے دستاویزی ثبوت پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں کی صورت ظاہر ہوئے، آوردۂ ثانی سے تن آسانی کے باوجود تین بیٹے اور تین مزید بیٹیاں جریدۂ عالمِ ثانی و فانی پہ ثبت ہوئیں۔ لسان العصر نے سچ ہی کہا تھا کہ:

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

1952ء میں یہ حضرت پانچ سالہ پاکستان سے آنکھ بچا کے کسی نہ کسی طرح پیدا ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چودہ بچوں میں پرورش پانے کے پیچھے یقیناً مل ملازم والد کا ہاتھ رہا ہوگا لیکن جملہ برادران و خواہران میں چودھویں کے چاند کا درجہ اختیار کر جانے کے پیچھے یقیناً ان کی اپنی کاوشوں اور پالن ہار کی نوازشوں کو دخل ہے۔ موصوف چھے بیٹیوں کے محب و مسرور والد اور ایک عدد بیوی کے مشہور و مفرور شوہر ہیں۔

ان کے رات دن کے سفری اشواق کا یہ عالم ہے کہ آج اگر ابنِ بطوطہ زندہ ہوتا تو نہ صرف شرمندہ ہوتا بلکہ گھٹنا ٹیک کے ان کے ہاتھ پہ بلامشروط بیعت کرتا اور اپنی دستارِ فضیلت تُرت اتار کر ان کے گول مٹول سر پہ رکھتا۔ واسکوڈے گاما تو روایت کا نشہ پورا کرنے کے لیے کالا کڑا لگ سے دان کرتا۔ ستر سال کی عمر میں بھی ان کے تحرک و تموّج کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ صبح دس بجے اگر ایف سی کالج کے کسی ٹھنڈے کلاس روم میں ٹھنڈے ٹھار طلبہ و گرما گرم طالبات کو مشرقی لباس پہن کے، مغربی تنقید پڑھاتے آپ نے انھیں اپنی ننگی آنکھوں سے بھی دیکھا ہو تو دوپہر کو فون کرنے پر فیصل آباد کی دیمن یونیورسٹی میں کسی منظوم خاتون سے اس کے نثری مقالے کے شعری محاسن پوچھتے پائے جائیں گے۔ شام کو کھوج لگائیں تو لاہور کے ٹی ہاؤس میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین قدیم کے ایک ہی سال میں منعقدہ چوتھے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ملیں گے۔

ہمارے جیسا شوخ اگر کبھی موقع میسر آنے پر امریکا چلا بھی جائے تو ایک مہینا تو کڑک مرغی کی سی حیرت، جھجک اور تھکن اتارنے کے بہانے کسی کونے سے لگ کے گزار دے۔ ایک یہ حضرت ہیں کہ جونہی نیویارک ایئرپورٹ سے اپنا بکسا اٹھا کے کسی بیٹی کے گھر لینڈ کرتے ہیں۔ چھاء ویلے کی چاء پیتے ہی کچھ دیر بعد مین ہیٹن کے کسی کھوے سے کھوا چھلنے والے

مال میں نیم برہنہ گوریوں کے پیش نظر میں وی لاگ بلکہ شی لاگ بناتے پائے جائیں گے۔ شام کو امریکا کے کسی اِچھرہ مارکہ کافی ہاؤس میں دیکھے دیکھے احباب کے بیچ اَن دیکھے ادبی مغالطے حل کرتے ملیں گے۔ اگلے دن دَھمی ویلے آپ فیس بک کھولیں تو جَیل شیل لا کے، بودے شودے واء کے کسی مشی گن کی تلاش میں بر سرِ کار ہوں گے۔ ایک صبح آپ انھیں کسی انگریزی یونیورسٹی کے اُردو شعبے کے مرتبہ نصاب کی چھان بین کرتے ہوئے دیکھیں گے تو اسی شام سیکڑوں میل دور کے قصبے میں اپنی پاکستانی بیٹی کی انڈین سہیلی کے ہاتھ کے بنے بنارسی کباب کھاتے احباب کو رشک سے ہم کنار کرتے ملیں گے۔ ہوتے ہوتے ایک مہینے میں اتنا امریکا دریافت کرلیں گے کہ کسی امریکی کو بھی جرأت نہ ہوئی ہوگی۔ ان کی قیامِ امریکا کے دوران کی پوسٹیں دیکھ کے لگتا ہے کہ کولمبس نے زمین کا یہ ٹکڑا محض ان کی آوارہ گردی کی تسکین کی خاطر دریافت کیا تھا۔ ایک بار امریکا سے واپس آئے تو بتانے لگے کہ پچھلی دفعہ میری کالی شلوار وہاں رہ گئی تھی، وہ لینے گیا تھا، یہ آج تک نہیں بتایا کہ شلوار رہ کس وجہ سے گئی تھی!! ویسے منٹو کے بعد یہ دوسری قابلِ توجہ 'کالی شلوار' ہے۔

بول رہے ہوں تو حافظے پہ رشک آتا ہے، کھا رہے ہوں ہاضمے پہ۔ اگر کبھی ان سے ہم ماضی کی فتوحات اور کارناموں کا پوچھ بیٹھیں تو مجال ہے ٹُٹ پُنجے یگانہ اور مردانہ قسم کے تنقیدی مقالات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ حالانکہ اچھے خاصے اہلِ نظر اور خوش خیال و خوش لباس و خوش خرام و خوش طعام ہیں۔ آج بھی ڈھنگ سے جین پہن لیں تو کتنی ہی حسیناؤں کی جان نکال لیتے ہیں۔

آں جناب کی تعلیم و تعلم کا قصہ یوں ہے کہ اکیس سال بطور طالب علم و اُستاد، ملتان جیسی نہایت گرم سرزمین پر مخلوط ماحول میں نہایت سرگرم رہے۔ تیرہ سال جامعہ اسلامیہ کے غیر اسلامیہ کیمپس میں افسرِ شاہانہ کی حیثیت سے بسر کیے۔ اسی طرح کسی نگران حکومت کی مانند دو برس مرکزی دارالحکومت پہ نظر رکھی اور چار و ناچار ہے زلیخائی دھرتی پہ عین زنانِ مصر کے بیچوں بیچ گزارے، جس کی بابت نسیم لیہ نے مبنی بر حقیقت شعر کہا تھا کہ:

دیارِ مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو
ستم ظریف پیمبر خرید لیتی ہے

حکیم جی تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر ان کے مہینہ تدریسی تجربے کے مہ و سال کو کیلکولیٹر کی مدد اور احتیاط سے اکٹھا کیا جائے تو یہ دورانیہ شاید ان کی اصل عمر سے بھی زیادہ نکلے۔ مرزا مُفتہ کے بقول پوری چار دَہائیاں، دُہائیاں دیتی بے عنوان نظموں، اِٹھلاتی رباعیوں اور بغیر مقطعے والی غزلوں کے درمیان اتنی مصروفیت کے ساتھ گزاریں کہ شاعری تک کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ یہ شوق بھی تنقیدی کتابوں کے نگاہ، ماہ و سالِ عندلیب، نظارہ رُوئے جاناں جیسے شاعرانہ نام رکھ کے پورا کیا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے محتاط محقق سے بھی کسی ہرجائی محبوب کی بابت، شاعری کی زبان سے یہ بریکنگ نیوز جاری ہوگئی تھی کہ:

چراغ ایک ہے اور دو گھروں میں جلتا ہے

ہمارا اندازہ ہے کہ یہ حضرت شاعری کے کوچے میں قدم دُھرنے سے اس لیے گریزاں ہیں، انھیں خدشہ ہے کہ ہر محفل میں پسند کیے جانے والے اس چہار چشم فن کار کے اپنے ہی قلم سے کسی روز آمد کی رَو میں یہ بات کسی نہ کسی طور ادا ہو جائے گی کہ:

چراغ ایک ہے اور سَو گھروں میں جلتا ہے

بھڑک اُٹھی ہے ترے حسن بے مثال کی آگ
بجھے گی کیسے بھلا اب مرے خیال کی آگ
خیالِ یار کی تفصیل کیا بتائے کوئی
کبھی فراق کا قصہ، کبھی وصال کی آگ
مجھے ہے خوف کہیں خودکشی نہ کر جاؤں
اگر عروج پہ لپکی کہیں زوال کی آگ
کہیں نہ دنیا یہ ساری لپیٹ میں آئے
میں ڈر رہا ہوں لگے نہ ترے جمال کی آگ
تو آسمان بھی پھر بچ نہ پائے گا اس سے
اگر زمیں پہ لگائی گئی زوال کی آگ
کسی کی آنکھ کو خوشیوں سے بھر دیا گیا ہے
کسی کی آنکھ میں رکھی گئی ملال کی آگ
یہ جذب شوق یہ مستی یہ ریگزارِ جنوں
یہ رقص کرتی ہوئی خون میں دھمال کی آگ
اُٹھائے پھرتا ہوں لب پر سوال میں فرخ
کوئی جواب دے جس سے بجھے سوال کی آگ

سیّد فرخ علی جواد

کاغذی کشتیاں بنانے میں
مٹ گئی عمر جی لگانے میں
اب نہ دل ہے نہ درد باقی ہے
تو ملا بھی تو کس زمانے میں
اک بھرم تھا سو وہ بھی ٹوٹ گیا
کیا ملا تجھ کو آزمانے میں
کچھ تو کردار آپ کا بھی ہے
درمیاں فاصلے بڑھانے میں
سارے موسم گزر گئے مجھ میں
دیر کر دی نا مجھ تک آنے میں
صاف دھڑکن سنائی دیتی ہے
جیسے دل ہے مرے سرہانے میں
نیند یا خواب کے جھروکوں میں
میں کہاں ہوں ترے فسانے میں
رائیگاں کر دی ہم نے بھی تو سحر
زندگی روٹھنے منانے میں

نادیہ سحر

جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں

مرزا کاظم رضا بیگ

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی سندھ میں آمد تاریخ سندھ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی سلطنت عراق سے لے کر چین کی سرحد تک اور کابل سے مغربی ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو اپنی حکومت کے دوران تاتاری یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی پوری زندگی معرکہ آرائیوں میں گزری۔ یہاں تک کہ وہ سنہ 617ھ میں جزیرہ آب سکوں میں مر گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے اس کی حکومت سنبھالی۔ اس کے حکومت سنبھالتے ہی اس کے اور اس کے بھائیوں کے درمیان اختلافات کا زنجیرہ کھل گیا۔ اس بنا پر اس نے خوارزم شاہ کی سکونت ترک کر دی۔ اسی دوران چنگیز خان نے خوارزم شاہ پر یلغار کر دی اور وہاں کے حکمرانوں کو معہ خدم وحشم کے گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ اس سے پہلے چنگیز خان نے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے ظلم و جور، اس کی سفاکی اور بربریت کی آگ فرو نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عذابِ الٰہی چنگیز کی صورت میں پورے وسطی ایشیا میں مسلط ہو گیا ہے۔ خوارزم اور سمرقند کی فتح کے بعد اس نے ترمذ پر فوج کشی کی۔ ترمذ کے باشندوں نے شہر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ اگر انہوں نے قلعہ اور فصل کو منہدم کر دیا اور شہر کے دروازے کھول دیے تو ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے چنگیز خان کی چیرہ دستی اور سفاکی کے واقعات سن رکھے تھے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا، جس پر اس نے ان کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ترمذ پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے پوری آبادی کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بدخشاں کی راہ لی۔ بدخشاں کے بعد بلخ پہنچا۔ بلخ کے باشندوں نے اس کی لاشوں کے پشتے لگا دیے۔ اس وقت جلال الدین خوارزم شاہ غزنی میں موجود تھا۔ بلخ سے غزنی کی مسافت زیادہ نہیں تھی۔ چنگیز خان نے اپنے لشکریوں کو اس کے تعاقب کا حکم دیا اور خود غزنی پہنچ گیا۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ جلال الدین خوارزم شاہ ہندوستان کے ارادے سے روانہ ہو چکے ہیں۔ چنگیز خان نے اس کا تعاقب جاری رکھا، اس وقت جلال خوارزم شاہ نے دریائے سندھ تک مسافت انتہائی تیزی سے طے کر لی تھی اور چنگیز خان نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کے پاس بہت مختصر سپاہ تھی۔ اس سے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس مختصر سی سپاہ کو لے کر چنگیز خان کے ہزاروں لشکریوں کا مقابلہ کرتا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے یا تو چنگیز خان کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے یا دریا میں ڈوب مرے۔ اس نے اس موقع پر انتہائی بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنی زندگی پر کھیل کر اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور تیزی سے تیرتا ہوا نکل گیا۔ چنگیز کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ ہر باپ کا بیٹا جلال الدین خوارزم شاہ جیسا ہونا چاہیے۔

جلال الدین خوارزم شاہ کی یہ شکست اور فرار نے اس کی اولوالعزمی اور بہادری کو مزید جلا دی۔ اس کو توقع تھی کہ ہندوستان کا فرمانروا سلطان شمس الدین التمش اس کی مدد کرے گا لیکن اس نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ وہ مایوس ہو کر لاہور کے متصل پہنچا تو وہاں اس سے اس کے دس ہزار لشکری آ ملے جو اس سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نے ان ہی پر انحصار کیا اور ان ہی کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم بنانا چاہا۔ چنانچہ اس نے کھوکھروں کو شکست دی اور کثیر مالِ غنیمت لے کر واپس ہوئے۔ پھر جلال الدین نے کھوکھروں کے راجہ سے اس کی بیٹی کا رشتہ اپنے لیے طلب کیا۔ اس راجہ نے اس کا یہ مطالبہ نہ صرف منظور کیا، بلکہ اپنے لڑکے کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی جمعیت اس کے حوالے کر دی۔

کھوکھروں کے راجہ اور اُچ اور ملتان کے فرمانروا صدرالدین قباچہ کے درمیان عرصہ سے عداوت چلی آ رہی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کھوکھروں کے راجہ نے جلال الدین خوارزم شاہ کو ناصرالدین قباچہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ جلال الدین اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک سپہ سالار اوزبک تائی کی سرکردگی میں ایک فوج اُچ کی طرف روانہ کی۔ ناصرالدین قباچہ نے اُچ سے تین میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے اپنے بیس ہزار سپاہیوں کے کیمپ لگا رکھے تھے۔ اوزبک تائی کے ہمراہ صرف سات ہزار لشکری تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ان لشکریوں سے مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے مقابل کے بجائے قباچہ کے لشکریوں پر شب خون مارا۔ یہ صورت حال بڑی پریشان کن تھی۔ قباچہ کے لشکری شکست کھا کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ قباچہ کے لیے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے اسی وقت کشتی میں سوار ہو کر بکھر کی راہ لی۔ اس کے بعد اوزبک تائی کے لیے اُچ کی فتح آسان ہو گئی۔ وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ قباچہ کے فوجی کیمپوں میں داخل ہوا۔ وہاں جتنے بھی سپاہی رہ گئے تھے ان کو قید کر کے جلال الدین کو اطلاع بھجوائی کہ اُچ بھی فتح ہو گیا ہے۔ قباچہ نے بکھر سے ملتان کا قصد کیا۔ ابھی وہ ملتان پہنچا ہی تھا کہ اُسے جلال الدین کا فرمان ملا، جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ وہ خراج ادا کرے۔ قباچہ کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا

کہ وہ اس کا ہر مطالبہ منظور کرے۔ قباچہ نے اس کا ہر مطالبہ پورا کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے علاقوں کو مزید نقصان نہ پہنچائے۔ جلال الدین نے اسے یقین دلایا کہ اس کے علاقوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے موسم گرما گزارنے کے لیے کسی سرد مقام کی راہ لی۔ جب وہ قلعہ راوڑ کو فتح کرنے کے بعد گزر رہا تھا تو کسی مخالف سپاہی کے تیر چلنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اس نے اس غلطی کی سزا قلعہ والوں کو یہ دی کہ ان سب کو قتل کرا دیا۔ اسی دوران چنگیز خان، جلال الدین کو ڈھونڈتا ہوا۔ سندھ میں داخل ہو گیا اور قباچہ پر ٹوٹ پڑا۔ قباچہ کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ چنگیز خان کی یلغار کا سامنا کرتا۔ اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ ملتان کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائے۔ چنگیز خان کے لشکریوں نے چالیس دن سے زائد قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا، لیکن ان کی ایک بھی نہ چلی، چونکہ قباچہ نے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے اپنے تمام خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ مزاحمت کی جس سے مایوس ہو کر چنگیز خان کے لشکر کو بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

چنگیز خان کے واپس جانے کے بعد جلال الدین کی جان میں جان آئی تو اس نے ملتان سے گزرتے ہوئے قباچہ سے اس رقم کا مطالبہ کیا جو اس کے علاقے کو تاخت و تاراج سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی جانب سے دی جانے والی تھی۔ قباچہ نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ اس نے پہلی مرتبہ خراج ادا کر کے غلطی کی تھی۔ اب اگر اس نے یہ مطالبہ پورا کر دیا تو پھر اس کے سارے خزانے مطالبے پورے کرنے میں خالی ہو جائیں گے۔ اس نے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ اگر جلال الدین کو جنگ ہی کی خواہش ہے تو پھر میں بھی مقابلہ پر آتا ہوں۔ قباچہ کو اپنے لشکریوں کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ وہ فوری مقابلے کے لیے نکل آیا۔ ملتان سے کچھ فاصلے پر اس کے اور جلال الدین کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی، لیکن جلال الدین شکست کھا کر اُچ کی طرف نکل گیا۔ جب اُچ کے لوگوں نے جلال الدین کی ناکامی اور شکست کے واقعات سنے تو دلیر ہو گئے۔ انہوں نے اس کو فاتح تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر جلال الدین خوارزم شاہ نے مشتعل ہو کر پورے شہر کو آگ لگا دی اور سیہون کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت سیہون پر فخر الدین سالاری کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے سپہ سالار لاچین ختائی کو جلال الدین کے مقابلے کے لیے بھیجا، لیکن لاچین ختائی کے قتل کے بعد میدانِ جنگ کی حالت بدل گئی۔ جلال الدین نے آگے بڑھ کر پورے سیہون کا محاصرہ کر لیا اور آمد و رفت کے تمام وسائل محدود و مسدود کر دیے۔ اس صورت حال سے پورے شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ لوگ فاقہ کشی سے تنگ آ کر خود فخر الدین سالاری کے در پے ہو گئے۔ اس نے صورت حال کو بھانپ لیا اور اسی وقت جلال الدین کی خدمت میں پہنچ کر اپنی تلوار اس کے قدموں میں ڈال دی۔ جلال الدین خوارزم شاہ اس کی اطاعت کشی پر بہت خوش ہوا۔ پھر ایک ماہ قیام کرنے کے بعد جب واپس جانے لگا تو سیہون کی حکومت دوبارہ فخر الدین سالاری کے حوالے کر دی۔ سیہون سے نکل کر جلال الدین نے دیبل کے قریبی علاقوں پر توجہ دی اور دیبل کے راجہ کو جب یہ علم ہوا کہ جلال الدین اس پر حملہ کی غرض سے اس کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے تو خوف سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ انتہائی بدحواسی کی حالت میں کشتی میں بیٹھ کر سمندر کے راستے کسی نامعلوم مقام کی طرف فرار ہو گیا۔ جلال الدین نے اس کے علاقوں میں پہنچ کر دیبل کے متصل اپنے خیمے نصب کیے۔ شہر کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کے دوران بے شمار دولت اس کے ہاتھ آئی اور اُسے اپنے لشکریوں کو خورسند اور مستعد رکھنے کا موقع ملا۔ اس نے دیبل میں قیام کے دوران خاصی خان کی سرکردگی میں نہر والا کی طرف اپنی ایک فوج بھیجی۔ خاصی خان نے نہر والا پر چڑھائی کی اور وہاں سے بے شمار ساز و سامان اور بھاری تعداد میں اونٹ لے کر واپس لوٹا۔ جلال الدین نے اس کی دلیری اور بہادری کی بڑی تعریف کی۔ پھر دیبل کے بت خانہ کے مقام پر ایک جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے حکم پر چند ہی دنوں میں ایک عالی شان مسجد تعمیر ہو گئی اور اس میں اس کے لشکری باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ اس کے بعد اس نے منصورہ اس سے ملحقہ علاقوں پر بھی قبضہ جما لیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ سنہ 621ھ میں سندھ کی مہم سے فراغت پانے کے بعد کرمان کے راستے سے عراق پہنچا اور پھر اس نے اپنی لیاقت اور تدبر سے اپنی فوجی استعداد اس قدر بڑھائی کہ فارس، گرجستان، عراق آذربائیجان اور خلاط کے علاقے اس کی تحویل میں آ گئے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گیا۔ اگرچہ اس زمانے میں چنگیز خان مر چکا تھا، لیکن اس کے لشکری جلال الدین کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب وہ خلاط میں تھا تو چنگیزی لشکریوں کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا۔ جلال الدین نے اپنے سپہ سالاروں سے کہا کہ تم اس دستہ کو اس وقت تک لڑائی میں مصروف رکھو جب تک کہ میں نہ نکل جاؤں۔ چنانچہ وہ خلاط سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور بڑی مشکل سے میان فارقین کے ایک قصبہ میں پناہ لی۔ چنگیزی لشکری یہاں بھی پہنچ گئے۔ یہاں سے نکل کر وہ کسی اور مقام کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کردوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اس نے کہا میں جلال الدین ہوں، تمہیں اتنے خزانے دوں گا کہ تم کو زندگی بھر لوٹ مار کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کردوں کے سردار نے اس کی جان بخشی کی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اس سردار کے بھائی نے پہنچ کر بتایا کہ یہ جلال الدین تو ہمارے باپ کا قاتل ہے۔ لہٰذا کردوں نے اُسے سنہ 626ھ میں قتل کر دیا۔

بیسویں صدی میں اُردو غزل کے عمومی رجحانات

لبنیٰ صفدر

بیسویں صدی میں اردو غزل متنوع رجحانات و موضوعات کی حامل رہی۔ اس دور میں عاشقانہ معاملات کے ساتھ سیاسی، سماجی و معاشی مسائل بھی غزل کا موضوع بنتے رہے۔ سرسیّد، حالی اور شبلی وغیرہ نے سماجی اصلاح کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے اس میں ملکی اور قومی مسائل کو پیش کر کے غزل کا ایک نیا منظرنامہ قائم کرنے کی کوششیں کی۔ حالی کی تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے اس عہد میں عظمت اللہ خان، کلیم الدین احمد اور جوش ملیح آبادی نے خاص طور پر غزل کی مخالفت کا رویہ اپنایا اور اس صنف سخن پر خوب اعتراضات کیے۔ اس عہد میں غزل کی نسبت نظم کو اظہار کے لیے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کی تحریکیں بنیادی طور پر نظم گو شعرا کی تحریکیں تھیں۔

قیام پاکستان تک ہندوستان کے تمام اہم مراکز میں خاص طور پر پنجاب میں بھی جدید اُردو غزل کی روایت مستحکم ہو چکی تھی۔ بیسویں صدی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا اثر اس وقت کے تمام شاعروں اور ادیبوں نے قبول کیا۔ معاشرے کے درمیانے طبقے میں مقبول ہونے والے جدید مذہبی اور سائنسی تصورات کے زیر اثر ملائیت کی مخالفت ہو رہی تھی۔ اس کے برعکس فطرت اور انسان کے وجود کو تسلیم کیا جانے لگا۔ کلاسیکی غزل کی نسبت بیسویں صدی کی غزل میں سراپا نگاری کی روایت کمزور پڑ چکی تھی اسی طرح عاشقانہ تلمیحات قدیم معانی کے ساتھ نئے مفاہیم میں بھی مستعمل تھیں۔ تمثالیں مسلسل وسعت پا رہی تھیں اور نئی تمثالوں کا بڑا ماخذ فطرت تھی۔ کلاسیکی غزل کے استعارات و تشبیہات قدیم معانی کے ساتھ جدید معانی و مفاہیم میں بھی استعمال ہو رہے تھے۔

بیسویں صدی کی غزل نے لسانی اور تہذیبی سطح پر اپنے مقررہ معیاروں کے خلاف بغاوت کر کے ذخیرۂ الفاظ کے دائرے کو وسعت دینے اور تہذیبی سرمائے میں اضافہ کرنے کا ڈول ڈالا۔ بقول ڈاکٹر سعد اللہ کلیم:

''اُردو غزل کی مجموعی روایت تخصیص کی جگہ تعمیم اور تجسیم کی جگہ تردید کی طرف مائل رہی ہے۔ جدید اُردو غزل نے اپنا سفر اس کے برعکس تجرید سے تجسیم اور تعمیم سے تخصیص کی جہت میں اختیار کیا ہے۔''

بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں ''شاد عظیم آبادی''، ''اکبر الٰہ آبادی''، ''عزیز لکھنوی''، ''محشر لکھنوی''، ''ریاض خیر آبادی''، ''رضا علی وحشت''، شوکت علی خاں فانی''، ''حسرت موہانی''، ''جگر مراد آبادی''، اصغر حسین گنڈوی''، ''مولانا محمد علی جوہر''، ''محمد اقبال''، ''فراق گورکھپوری''، ''جوش ملیح آبادی''، ''وحید دہلوی''، ''اثر لکھنوی''، ''آرزو لکھنوی''، ''ہادی مچھلی شہری''، ''معین احسن جذبی''، ''یگانہ چنگیزی''، اسرار الحق مجاز'' اور اس قبیل کے دیگر شعرا نئے رجحانات اور موضوعات کو لے کر نہایت منفرد شاعری کر رہے تھے جس سے جدید اُردو غزل کے نئے خدوخال واضح ہوئے اور غزل کے بیمار جسم میں ایک صحت مندانہ تبدیلی رونما ہوئی۔ حب الوطنی کا احساس بڑھتا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تھی۔ یہی احساس بیسویں صدی کی شاعری کو قومی جذبات و احساسات کی شاعری بناتا ہے۔

حالی کی نظم حب الوطنی ہو یا اقبال کا ترانۂ ہندی اس عہد کی شاعری وطن کی عظمت کی مداحی تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ سیاسی تحریکات سودیشی تحریک اور بردہ تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ جوش کے دور سے اعلانیہ بغاوت کا آغاز ہوا۔

مردہ باد اے ایشیا اے سرزمیں زرفشاں
آ گئی وہ ساعتِ بیداری ہندوستاں

بقول پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد:

''اس دور کے تقریباً تمام شعراء وطن پرستی کے اسی جذبے سے سرشار ہیں جس کا واضح اسلوب تندی، تیزی اور انقلاب ہے۔ اختر شیرانی جو بنیادی طور پر شاعرِ رومان ہیں ساقی کے ہاتھ میں بھی تلوار دیکھنا چاہتے ہیں ''اُٹھ ساقی تلوار اُٹھا'' آگے چل کر مجاز اور جذبی بھی رومان و حقیقت کے اس سنگم پر نظر آتے ہیں۔''

اسی طرح حسرت اور جگر جیسے غزل گو بھی وطن اور آزادی کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ گویا نظم ہی نہیں اس دور کی غزل بھی ایسے خیالات سے لبریز تھی۔

پرائے ہاتھ جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

حفیظ، ساغر، احسان دانش، سیماب، روش صدیقی، غلام ربانی تاباں وغیرہ وہ شاعر ہیں جن پر رومانی اثرات بہت گہرے تھے۔ اس لیے ان کی وطن پرستی شدید جذباتیت لیے ہوئے ہے۔ ان کے ہاں سیاسی عمرانی، معاشی مسائل کم بیان ہوئے ہیں۔ مگر ان سب نے وطن پرستی کے موضوع کو ضرور اختیار کیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حب الوطنی بیسویں صدی کے آغاز کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ حالات کی تبدیلیوں نے موضوعات اور رجحانات کو تبدیل ضرور کیا۔ ان کا آغاز سماجی اور اصلاحی خیالات سے ہوا۔ سیاسی عنصر داخل ہوا۔ آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی۔

رُکی رُکی سی شبِ تار ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
(فراقؔ)

اقبال عہدِ جدید کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قوم وملت کی اصلاح اور اجتماعی فکر رکھنے کے باوجود اپنی انفرادی شان بھی قائم رکھی اور ایک فرد کو تمام قسم کے ہنگاموں اور تماشوں سے نکال کر عرفانِ ذات سے منسلک کرتے رہے۔

کاخ وہ دے کہ جس کی کھنک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو
(اقبالؔ)

اقبال بدلے ہوئے حالات میں عرفانِ ذات کی بات اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک فرد کا اندر سے بدلنا اور زندگی کے مختلف مسائل کا علم وآگہی کی روشنی میں مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا زیادہ اہم ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
(اقبالؔ)

جب آزادی مل گئی تو اپنے خوابوں کے مطابق وطن کو ڈھالنے کی فکر شاعری کا موضوع بنی جو اَب تک چلی آ رہی ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ادبی اُفق پر نمایاں ہونے والے غزل گو شعرا برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ان شعرا میں عبدالمجید سالک، محمد دین تاثیر، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احسان دانش، عابد علی عابد، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، مجید امجد، میراجی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، انجم رومانی، باقی صدیقی، مختار صدیقی، عبدالمجید عدم، عارف عبدالمتین، یوسف ظفر، قتیل شفائی، ضیا جالندھری، ساقی فاروقی۔

اس دور میں غزل حالی کی جدید غزل سے مماثلت رکھتی ہے۔ بہت سے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں حسن وعشق کی متعلقات کے ساتھ وابستہ نفسیاتی وتاثیراتی کوائف بھی سادگی، شوخی اور شرارت کے ساتھ ساتھ حقیقت اور انقلاب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

اسی طرح فیض کی غزل میں عشقیہ علامات قفس، صیاد، ساقی، گلشن، ناصح وغیرہ کی اصلاحات سیاسی معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ فیض کے لہجے میں نرمی اور دھیما پن ہے۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
(فیضؔ)

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
(فیضؔ)

بیسویں صدی میں زندگی کے ہر میدان میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سائنس نے برق رفتاری سے ترقی کی۔ اس طرح سیاست، معاشرت، صحافت اور تہذیب وتمدن میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لامحالہ اس کا اثر ادب پر بھی پڑنا تھا۔ اردو ادب میں بہت سی تحریکیں سامنے آئیں جن میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک نمایاں ہیں۔ جنھوں نے قدیم نظام کے خلاف بغاوت کی اور جدید شاعری کو نئے طرز اور رنگ میں ڈھالا۔ اقبال بیسویں صدی میں نئی تحریکوں کے سرچشمہ تھے۔

رومانوی تحریک کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ کی تحریک کے خلاف انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''آثار وقرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومانیت کی تحریک کو عہدِ اقبال میں زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اس تحریک نے کم وبیش چالیس برس تک ہر صنفِ سخن کے ادبا کو اپنے داخلی جادو اور لاأبالی پن سے متاثر کیے رکھا۔''

رومانوی تحریک کے باطن سے اُردو ادب کی طاقتور اور منظم تنظیم ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی جس نے معاشرے کی فرسودہ قدروں پر کاری ضرب لگائی۔ اپنے منشور پر عمل کیا اور اعلیٰ ادب تخلیق کیا۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

''ترقی پسند تحریک ایک مؤثر اور پرجوش سماجی تحریک تھی۔ اس تحریک نے معاشی ناانصافی کے دور میں انسانیت اور مساوات کو مذہب کا درجہ دیا اور ادیب کو سائنسی اور تجزیاتی نقطہ نظر سے آشنا کیا۔ اس تحریک نے استحصال کے خلاف سماجی انصاف کا احساس پیدا کیا۔''

اسی دور میں ایک اور مؤثر اور فعال تنظیم حلقہ اربابِ ذوق اُبھر کر سامنے آئی جس کو انقلابی کروٹ میراجی کی شمولیت سے حاصل ہوئی۔ حلقہ اربابِ ذوق بھی ادب کی موجودہ صورت حال کو بدلنے اور ادب کے داخلی جن کو اُجاگر کرنے کی داعی تھی۔ اس نے ترقی پسند کی مقصدیت کے خلاف ردِعمل کا اظہار کیا۔ بقول انور سدید:

''اس تحریک کے ادبا فرد کے اندر کی گم شدہ آواز کو سننے اور ادبی انجماد کو تجدد تخلیق سے توڑنے میں کوشاں رہے۔''

قاسم علی شاہ

ایک تو غم روزگار، وہ اس لیے بھی اہم تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں بڑا بچہ تھا اور میرے تمام بہن بھائی زیر تعلیم تھے۔ میرے اندر ذمہ داری کا احساس بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔ حالانکہ میرے والد دو دو نوکریاں کر کے ہماری پرورش اچھے طریقے سے کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ذمہ صرف اپنی ذاتی زندگی نہیں ہے بلکہ بہن بھائیوں کی مدد کرنا اور والد کا ہاتھ بٹانا بھی ہے۔ اسی سوچ اور نظریے کے ساتھ میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ پڑھانا میرا جذبہ اور شوق بھی تھا، بلکہ میں اسے اپنا عشق کہوں گا جس پر مجھے فخر ہے، اسے میں اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سمجھتا ہوں کہ اس نے مجھے پڑھانے اور تربیت دینے کا فن بخشا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکل تبدیل ہوتی رہی جو کہ ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ تو جدوجہد کا ایک رُخ تھا، دوسری جدوجہد خود شناسی کی تھی۔ یہ خود شناسی بھی پورا پیدائش کا عمل ہے۔ یہ کوئی فوری اور آسان عمل نہیں جسے بٹن دبایا اور خود شناس ہو گئے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے آپ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دور پڑے چراغ کو دیکھتے ہیں۔ یہ غیب سے دور سے آنے والی آواز ہے۔ آپ جس کا پیچھا کرتے کرتے کسی مقام کو پا لیتے ہیں۔ جب میں خود کو ڈھونڈتا تھا کہ میں سائنس کا طالب علم ہوں UET میں پڑھتا ہوں، یہ تو میرے من کو نہیں بھاتا۔ اس شعبے کی تمام کامیابی کی کہانیاں مجھے تحرک نہیں دیتیں، بلکہ سرے سے پتہ بھی نہیں ہیں شاید جو سینئرز کی کامیابی کی کہانیاں تھیں، وہ بھی کوئی غیر معمولی نہ تھیں، یہی بس کہ اچھی نوکری مل گئی، گھر، گاڑی مل گئے۔ اس سے آگے تو وہ کہانیاں جاتی ہی نہیں تھیں۔ کوئی معنی خیز بات اور گہرائی ان میں نہ تھی۔ اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ میرا اُٹھنا بیٹھنا کن لوگوں کے ساتھ تھا۔ وہ مجلس بڑی بھرپور تھی۔ لکھنے پڑھنے والے لوگوں کے ساتھ ہی میری محفل رہتی تھی۔ وہ صاحب فکر لوگ تھے۔ یہ میری تیسری جدوجہد تھی کہ جن لوگوں کا ہم جماعت تھا ان سے زیادہ دوستی نہیں تھی اور جن کے ساتھ بیٹھنا اچھا لگتا تھا وہ مختلف اور میرے دل کے قریب شعبے سے تھے۔ اسی لیے نقطے سے نقطہ ملتا گیا اور ایک تصویر بن گئی۔ دنیا میں لوگوں کو سب سے زیادہ پچھتاوا مرتے وقت اسی بات کا ہوتا ہے کہ جو بننا چاہتے تھے، اس شعبے میں نہیں گئے اور اسی طرف چل پڑے جو اس دور کا ٹرینڈ تھا۔

ارژنگ: شاید اس دور میں کیریئر کاؤنسلنگ کا رواج نہیں تھا؟

قاسم علی شاہ: کیریئر کاؤنسلنگ کا رواج تو آج بھی نہیں ہے۔ یہ خود شناسی اور کیریئر کاؤنسلنگ آج کل متعارف ضرور ہوئی ہیں مگر مارکیٹ کا رُجحان آج بھی نہیں ہے۔ بازار کا رجحان آج بھی رٹے بازی، جی پی اے ہی ہے۔ عبدالستار ایدھی صاحب کے بقول ہم پڑھے لکھے جاہلوں کی فوج پیدا کر رہے ہیں۔ بیس سال پہلے کہے گئی ان کے الفاظ آج بھی سچ ہیں کہ پود نہ اپنے ہنر سے واقف ہے اور نہ ہی اپنی صلاحیت سے آگاہ ہے۔

ارژنگ: بات چل نکلی ہے تو اپنے بچپن کے بارے میں بتایئے۔ گردوپیش کے حالات ابتدائی زندگی؟

قاسم علی شاہ: میرا بچپن ایک جدوجد سے عبارت ہے۔ متوسط طبقے سے میرا تعلق تھا، والدین کی زندگی بھی بہتر زندگی کی کوشش میں سرگرداں تھی۔ میرے بڑے بوڑھے لاہور شفٹ ہو گئے تھے، گرچہ میری پیدائش گجرات کی ہے، تعلیم ابتدائی بھی میں نے لاہور ہی میں پائی اور بچپن کی یادیں بھی لاہور کی ہی ہیں۔ چھٹیوں میں اکثر گجرات چلے جایا کرتے تھے۔ والدین کی جدوجہد کی یادیں اور محرومیوں کا تذکرہ، دیکھیں محرومی بذات خود تحرک کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ آدمی کو اندر سے جگائے رکھتی ہے اور محنت پر آمادہ کرتی ہے۔ جو چیز نہیں ہے اس کو پانے کے لیے ارادے کی طاقت جگائے رکھتی ہے اور محنت پر آمادہ کرتی ہے۔ جو چیز نہیں ہے اس کو پانے کے لیے ارادے کی طاقت اکٹھی کر لیتے ہیں، پھر کر کے دکھاتے ہیں۔ میں بڑا شرمیلا تھا۔ کئی چیزیں مگر دلپذیر تھیں۔ اچھی کتابیں، اچھے ڈرامے، اشفاق احمد کا زاویہ دل کو چھو لیتا تھا۔ جن سے دوستی تھی بڑی گوڑھی، گہری تھی، حساسیت بہت زیادہ تھی طبیعت میں۔ یہ بعض اوقات تکلیف دہ بھی ہوتی ہے کہ حساسیت آپ میں کرب پیدا کرتی ہے۔ ایک غم اور دل ٹوٹنے والی کیفیت پیدا کرتی ہے اور وہیں سے گداز پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کے لیے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، آپ کسی کے درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ارژنگ: کیا یہ حساسیت ہی تھی جس نے ادب سے شغف پیدا کیا؟

قاسم علی شاہ: میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا البتہ میں ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ضرور ہوں۔ میرے لیکچرز ہوتے ہیں جنہیں کبھی مضامین کی شکل میں بھی لکھا کرتا تھا، اب میری ٹیم نے آسانی کر دی ہے کہ اس کو تحریری شکل میں لے کر آتے ہیں۔

ارژنگ: ادب اور تصوف باہمی طور پر کیا منسلک ہیں؟ آپ ادب کی وجہ سے تصوف کی طرف راغب ہوئے یا تصوف کے باوصف ادب کی جانب رجوع کیا؟ یہ جرأت کیسے ہوئی؟

قاسم علی شاہ: میرا خیال ہے کہ یہ ایک مزاج ہوتا ہے انسان کا جس سے پھر تلاش پیدا ہوتی ہے۔ ادب تو اس راستے میں پڑا ہوتا ہے، پہلے تو یہ تلاش ہے جو ماں کے پیٹ میں انسان کے ساتھ آتی ہے۔ روشنی کے راستے میں کھڑے سارے روشن لوگوں کو تلاش کرنا شروع کرنے پر آمادہ کرنے والی چیز تو مزاج ہے۔ بڑا آدمی کیا ہے؟ بڑے آدمی کی تعریف کیا ہے؟ یہیں سے آپ کے کردار کا پتا چل جاتا ہے۔ آپ کسی سے پوچھیں کہ بڑا آدمی کیا ہے؟ اس کے جواب سے ہی نکل آتا ہے کہ یہ آدمی خود کیا ہے۔ اگر خیر، درویشی اور فقر کے راستے پر چلنے والے لوگوں کو آپ بڑا آدمی سمجھتے ہیں تو پھر ان روشن لوگوں کے روشن رستے کی ایک کرن آپ کو بھی مل جاتی ہے۔

ارژنگ: تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور تصوف نے مل کر قاسم علی شاہ کو بنایا؟

قاسم علی شاہ: یہ دونوں ہی مددگار ہیں۔ بے انتہا مددگار۔

ارژنگ: اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیں؟ آپ کی کون سی تصنیف آپ کے دل کے بہت قریب ہے۔ کتنی کتابی منظر عام پر آ چکی ہیں؟

قاسم علی شاہ: میری ہر کتاب کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ شاید کہانی کے ساتھ ہم سب کا رابطہ، واسطہ بہت زیادہ ہے، میرا تو بہت زیادہ ہے۔ پہلی کتاب ''کامیابی کا پیغام'' 2008ء میں شایع ہوئی تھی۔ تب میری عمر کوئی ستائیس برس تھی۔ یہ بنیادی طور پر میرے اخبار کے نوجوانوں کے صفحے پر شائع ہونے والے مضامین تھے۔ جنہیں لوگوں نے بے حد سراہا۔ حالانکہ ان میں کئی فکری مغالطے اور ارتقائی اعتبار سے ایسی باتیں بھی ہیں جن میں تبدیلی آئی ہے۔ مگر میں نے فنی اعتبار سے کمزور چیزوں کو بھی ڈیلیٹ نہیں کیا تاکہ نئے آنے والوں کو حوصلہ ملے کہ ابتدائے سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ برٹینڈ رسل کا ایک بڑا شاندار جملہ ہے کہ میں اپنے نظریات کے لیے نہیں مر سکتا، چونکہ ہو سکتا ہے یہ غلط نکلیں، یعنی اتنی گنجائش ہونی چاہیے۔

ارژنگ: اب تک کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

قاسم علی شاہ: میری اب تک پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بڑی تعداد تو ان لیکچرز کی ہے جو مضامین کی شکل میں محفوظ ہوتے گئے اور بعد ازیں کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ مضامین کی شکل میں یہ مختلف میگزین میں شائع ہوئے۔ بلکہ پچھلے چند سال سے تو پنجابی اخبار میں بھی یہ شائع ہوئے ہیں۔ جن کا مجموعہ ''اندر بھانبھڑ بال'' اب تیار ہے اشاعت کے لیے۔

ارژنگ: آپ ادب دوست انسان ہیں، کبھی کسی ادبی تحریک سے وابستہ رہے؟

قاسم علی شاہ: میں کبھی کسی ادبی تحریک سے منسلک نہیں رہا مگر مجھے یہ لوگ بڑے پسند ہیں۔ مجھے یہ بڑے طلسماتی لگتے ہیں۔ امجد اسلام امجد صاحب، عطاء الحق قاسمی صاحب، کئی لوگوں سے میں مل نہیں سکا جیسے ممتاز مفتی، میرزا ادیب، کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہیں جیسے اشفاق احمد، بانو آپا مجھے یہ لوگ بڑے لگتے تھے۔ اس لیے کہ یہ لکھ کے بول کے، سوچ بدل دیتے تھے۔

ارژنگ: کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

قاسم علی شاہ: ہر شخص کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ سیاست میں صد فیصد حصہ لینے کی بات یوں ہے کہ یہ بنیادی انسانی حق ہے کہ اظہار رائے کی آزادی ہو اور اس کا احترام بھی کیا جائے۔ سیاست ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں انفرادی شخص کی اجتماعیت جنم لیتی ہے۔ لکھنے پڑھنے والے لوگوں کو تو ضرور حصہ لینا چاہیے لیکن ہمارا ملک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی اعتبار سے اس قدر منقسم ہو گیا ہے کہ ناقابل بیان ہے۔ اگر کسی لکھنے والے کی اسی فیصد تحریریں ایک ہی سیاسی قائد کے بارے میں ہیں تو یہ بات غیر مناسب ہے۔ یہ تو قصیدے لکھنے والی بات ہو جاتی ہے۔ توازن کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کوئی مصنف اپنی رائے کسی سیاسی معاملے پر دیتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔

ارژنگ: آپ کا تعلق کتاب سے بھی ہے اور الیکٹرانک میڈیا سے بھی ہے، کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا چلن عام ہو رہا ہے۔

قاسم علی شاہ: دیکھیں ایسا ہو تو کیا ہے مگر اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ کتاب کی اہمیت کم ہوئی ہے، کتاب پڑھنے والے آج بھی ہیں اور شاید ماضی کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوں گے۔ البتہ اتنے نہیں ہیں جتنے کہ ہونے چاہئیں۔ آپ دیکھیں کتاب میلے ماضی کے مقابلے میں زیادہ ہو رہے ہیں۔ آخر لوگ کتاب خریدتے ہیں تبھی یہ ایکسپو اور کتاب میلے سجتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اب آڈیو کتب آ گئی ہیں۔ کتاب سننا پڑھنے سے زیادہ آسان ہے۔ اس لیے لوگ گاڑی چلاتے، واک کرتے، چلتے پھرتے کتاب سن سکتا ہے۔ آج بھی مگر کتاب کی خوشبو اور لمس کی اپنی لذت ہے۔

ارژنگ: تخلیقیت آپ کے نزدیک کیا ہے؟ کسی اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

قاسم علی شاہ: کچھ نیا سوچنا، کچھ نیا کہنا، کچھ نیا لکھنا، یہی تخلیقیت ہے۔ مکھی پہ مکھی مارتے رہنا تو کوئی کام نہیں۔ بہت سارے لوگ صرف وضاحتوں پہ لگے رہتے ہیں۔ تخلیقیت ختم تو کبھی نہیں ہوتی البتہ معیار بعض اوقات گر جاتا ہے۔

ارژنگ: کوئی بے حد آسودہ لمحہ؟ تخلیقی سطح پر بھی اور عام زندگی میں بھی؟

قاسم علی شاہ: میں نے دیکھا ہے کہ وقت ہمیشہ آسودہ ہی ہوتا ہے، اسے آپ نے بس سمجھنا ہوتا ہے۔ جسے مشکل وقت سمجھ رہے ہوتے ہیں اس میں بھی کوئی آسودگی کے سامان پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یوں کہہ لیں نئے وقت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہوتی ہے۔ نوک پلک سنواری جا رہی ہوتی ہے۔

ارژنگ: انسان میں اتنی رجائیت اور مثبت فکر کیسے

آتی ہے؟

قاسم علی شاہ: توکل ہے، بھروسہ اور زندگی کے معنی سمجھنے کی بات ہے۔ ویل ڈیورنگ جو بڑا فلسفی ہے اس کی کتاب ''زندگی کے معنی'' اس بابت بڑی خوبصورت کتاب ہے، اس میں خطوط ہیں۔ اس کی کئی لائنیں اور اوراق مجھے بہت پسند ہیں، جن کا نچوڑ یہ ہے کہ زندگی کو معنی دینے پڑتے ہیں۔

ارژنگ: آپ کی شخصیت پر واصف علی واصف کے بڑے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ واصف صاحب سے اپنے تعلق خاطر بارے کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

قاسم علی شاہ: اپنی ذات کی کھوج میں جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ واصف علی واصف ہیں۔ واصف علی واصف کو میں نے سب سے زیادہ سنا ہے۔ ان کی آڈیو کیسٹس سے، پچیس سال کے اس سفر میں ان کی بدولت خود شناسی بڑی آسان ہوگئی ہے۔ دراصل کسی اچھے بولنے والے سے، اچھا لکھنے والے سے افراد ہی تیار ہوتے ہیں جو مشن کو آگے لے کر چلتے ہیں۔ میرے لیے واصف صاحب مشعل راہ ہیں کہ وہ ایک انگریزی کے اُستاد ہیں مگر ان سے کتنے لوگوں کی سوچ بدلتی ہے، کتنے لوگوں کا نظریہ بدلتا ہے، کتنے لوگوں کی زندگی بدلتی ہے، لوگوں میں توکل اور عشق رسولؐ بڑھ جاتا ہے۔

ارژنگ: کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ اس کے اندرون سے یا گردوپیش کے ماحول سے؟

قاسم علی شاہ: جتنا میں سمجھ پایا ہوں، ان کو تحریک بھی باہر کے حالات ہی دے رہے ہوتے ہیں۔ آتا اندر ہی سے ہے لیکن حالات و واقعات مہمیز دیتے ہیں۔ جیسے کنویں کا ڈول باہر سے آتا ہے مگر پانی اس کے اندر ہی پڑا ہوتا ہے۔ اندر سب کچھ پڑا ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں۔ کوئل نے رونا بھی ہے تو سننے والوں کو گیت سنائی دے گا۔ اس کی آواز ہی ایسی ہے۔

ارژنگ: عہد حاضر میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

قاسم علی شاہ: بڑا چیلنج ہے۔ اس سے تعمیر معاشرہ کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم سیاسی مقاصد کے لیے شدت کو بڑھانے کے لیے، معاشرتی و سماجی تقسیم کو بڑھانے کے لیے اور ایک ہائبرڈ وار کو لڑنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے مثبت کام آٹے میں نمک کے برابر لیا جا رہا ہے۔

ارژنگ: ذاتی تجربات و مشاہدات سے کسی فنکار کی تخلیق پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

قاسم علی شاہ: بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں چند دن پہلے آذربائیجان میں تھا تو اس کے عہد حاضر کے سب سے بڑے ادیب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کا انگریزی ترجمہ کتابی شکل میں مجھے پیش کیا۔ وہ تمام تخلیقات سوویت روس کے مظالم کے متعلق تھیں یا ان سے متاثرہ تھیں۔

ارژنگ: زندگی میں کیا کھویا۔ کیا پایا؟

قاسم علی شاہ: میرے خیال میں بندہ کھوتا تو کچھ بھی نہیں ہے، پا ہی رہا ہوتا ہے۔ اس کو اس زاویے سے دیکھیں کہ جب ہم آئے تھے تو کیا تھے؟ اور آج سے تقابل کریں تو جواب مثبت ہے۔ تمام اشاریے مثبت ہیں۔ اشفاق صاحب کے بقول اپنے پلے سے تو کوئی بھی کچھ نہیں دے رہا ہوتا، سب اس کے دیے ہوئے سے دیتے ہیں۔

ارژنگ: قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کے قیام کا خیال کیسے آیا؟ اس کے مستقبل کے اہداف کیا ہے؟

قاسم علی شاہ: یہ 2015ء کی بات ہے جب میری ویڈیوز اور لیکچرز وائرل ہوگئے۔ میرے دوستوں کا یہ خیال تھا کہ اس شہرت کا فائدہ اُٹھائے ہوئے کوئی خیر کا کام کر جائیں۔ یہ دنیاوی شہرت کوئی دائمی چیز تو ہوتی نہیں ہے۔ ایک غبارے کی مانند اس نے پھٹ جانا ہوتا ہے۔ اللہ نے فضل کیا اور 2017ء میں ہم نے بڑے تھوڑے سے وسائل کے ساتھ فاؤنڈیشن بنالی۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ جڑتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔ جس عمارت میں ہم موجود ہیں اس کو چھ سال ہو گئے ہیں اور یہ بڑا منظم ادارہ ہے جس سے بہت سارے خیر کے کام ہو رہے ہیں۔

ارژنگ: اس ادارے کے مالیاتی امور کیسے چلائے جاتے ہیں؟

قاسم علی شاہ: ہماری اس فاؤنڈیشن کا ایک بورڈ ہے جو یہ سب مالی معاملات کو فنانس کرتا ہے۔ ہمارا بڑا ہی خوبصورت ماڈل ہے، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ فاؤنڈیشن چندہ نہیں لیتی۔ ابھی تک ہم نے کبھی کوئی چندہ مہم نہیں چلائی۔ یہ بورڈ ممبرز جڑتے گئے اور انہوں نے طلباء کے وظائف اور دیگر امور اپنے ذمہ لیتے گئے۔

ارژنگ: الحمراء کی سربراہی بھی آپ نے کی، وہ تجربہ کیسا رہا؟

قاسم علی شاہ: وہ بڑا مشکل زمانہ تھا۔ مجھے وزیراعلیٰ نے یہ منصب سنبھالنے کی درخواست کی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سابقہ چیئرمین اس عمل سے اس قدر دل گرفتہ ہوں گے۔ حالانکہ وہ بڑے بھلے انسان ہیں۔ رضی احمد صاحب، میں نے حالانکہ انہیں بورڈ ممبر بنایا مگر وہ کام ہونے نہیں دیتے تھے۔ میرے خلاف محاذ کھولے رکھتے، خبریں لگواتے۔ وہاں مجھے سیکھنے کا بہت موقع ملا کہ الحمراء جیسا بڑا ادارہ، دو سو اڈو سو ملازمین کے باوجود کیوں کچھ ڈلیور نہیں کر پا رہا۔ سات آٹھ ماہ میں نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی بہتری کی صورت ہو جائے مگر اس کے بعد وزیراعلیٰ کو استعفیٰ دے دیا۔

ارژنگ: مستقبل میں ایسا عہدہ قبول کرنا پسند کریں گے؟

قاسم علی شاہ: آپ کے ہاتھ سے خیر جاری ہو یہ اصل چیز ہے۔ جو آپ سے برا کریں ان سے بھی اچھا کرنے کا مشن میرا مقصد ہے۔ عہدے چھوٹی چیز ہیں۔

ڈاکٹر ایوب ندیم

ڈاکٹر ایوب ندیم کے تخلیقی و تصنیفی شعبوں میں شاعری، ڈراما نگاری اور تحقیق و تنقید اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور کے لیے کالم نویسی اور انٹرویو نگاری بھی کی، لیکن اُن کا بنیادی تخلیقی حوالہ شاعری ہے۔ اُن کا شعری سفر 1980ء میں شروع ہوا۔ جلد ہی اُن کی شاعری اُس عہد کے مؤقر ادبی جرائد کی زینت بننے لگی۔ اپنی عملی زندگی میں تدریسی فرائض کے پہلو بہ پہلو گورنمنٹ کالج مصطفیٰ آباد میں بہ طور پرنسپل اور گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں بہ حیثیت صدر شعبہ اردو بھی خدمات انجام دیں۔ اُن کی تصانیف میں چاند میرا ہم سفر (شعری مجموعہ)، ہوئے ہم کلام (مشاہیر ادب کے انٹرویو)، ہم پھول ہم ستارے (بچوں کے لیے نظمیں)، رات ڈھلتی نہیں (غزلوں کا مجموعہ)، ٹہنیاں تے بور (پنجابی ڈرامے) اور اُجالا حضورؐ کا (نعتیہ مجموعہ) شامل ہیں۔ انہوں نے غزل اور نعت کے ساتھ ساتھ پابند، آزاد اور معرا نظمیں اور سانیٹ بھی لکھے ہیں۔ اُن کی شاعری کی خصوصیات کی بات کریں تو اُن کی شاعری میں ہجر و وصال ہے، آشوب عصر ہے، ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ مابعد الطبیعاتی مضامین ہیں، مزاحمت ہے رجائیت ہے اسلوب میں رمز و ایمائیت کو پسند کرتے ہیں اور فطرت کے گوناگوں رنگوں سے تصویریں بناتے ہیں، جسے آپ امیجری کہتے ہیں۔

ارژنگ: اپنے تعلیمی، نجی اور ادبی سفر کے بارے میں بتایئے؟

ایوب ندیم: یہ بات میرے لیے باعث طمانیت ہے کہ میرا تعلیمی سفر اچھا رہا۔ میٹرک، بی اے، ایم اے، سبھی امتحانوں میں فسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بی اے میں تو پورے ضلع کے آرٹس گروپ میں اوّل رہا۔ اُس وقت میں خواجہ فرید کالج رحیم یار خان کا طالب علم تھا۔ ایم اے اُردو کے لیے لاہور آیا تو اورینٹل کالج میں میرٹ کے اعتبار سے میرا رول نمبر ایک تھا۔ میں نے ایم اے کے حتمی امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ البتہ ایف اے کے دوران زندگی کا کچھ حصہ طلبہ سیاست کی نذر ہوا۔ سٹوڈنٹس یونین کا الیکشن بھی لڑا۔ ایک طلبہ تنظیم کا اعلیٰ عہدے دار بھی بنا۔ یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ اُن دنوں میں سیاست اور ادب کو ایک ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ سیاست میں دشواریاں بھی تھیں، جنرل ضیاء کا دور تھا۔ اپنی مرضی سے بولنے اور لکھنے پر پابندی تھی۔ پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل بھی جاری رہتا، مگر اس میں بھی ایک مزہ تھا، آخر ادبی سرور غالب آ گیا۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں ہی میری شاعری ملک کے اہم ادبی جرائد میں چھپنے لگی تھی، جیسے ڈاکٹر وزیر آغا کا اوراق، صبا لکھنوی کا ''افکار'' اظہر جاوید کا ''تخلیق''، اختر انصاری اکبر آبادی کا ''نئی قدریں''، نعیم صدیقی کا ''سیارہ'' اور سرکاری ادبی رسالہ ''ماہِ نو''۔ گویا میری سیاسی اور ادبی سرگرمیاں ہم رکاب تھیں۔ ان دنوں میں ادبی تقاریب میں نہ صرف شریک ہوتا، بل کہ خود بھی مشاعروں کا اہتمام کرتا رہتا تھا۔

ارژنگ: آپ کی نظر میں معیاری شاعری کیا ہے؟

ایوب ندیم: میری نظر میں معیاری شاعری وہ ہے جس میں تاثیر ہو اور دائمی ہو۔ ایسی تاثیر عصری آشوب کی کسک سے پیدا ہوتی ہے۔ جو شاعر محض اپنے ذاتی دُکھ سناتے ہیں، وہ بڑے شاعر نہیں بن سکتے۔ میرؔ کی شاعری میں اگر ''دل'' اور ''دلی'' ایک نہ ہوتے تو مصحفی اُن سے بڑا شاعر ہوتا۔ آج میرؔ کی قدر و منزلت اُس آنچ کی وجہ سے ہے جو آگ بجھنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ غالبؔ کے کلام میں جو تاثیر ہے وہ بھی اُن کی علمی صداقت کے باعث ہے۔ فلسفے اور نفسیات کی باریکیوں کو جس طرح انھوں نے سمجھا، کوئی دوسرا شاعر نہیں سمجھ سکا۔ اقبال اور فیض بھی اس لیے بڑے ہیں کہ انھوں نے اپنے زمانے کے دُکھ کو اظہار کی قوت دی۔ فنی مہارت تو کم و بیش ہر شاعر میں ہوتی ہے لیکن اس فنی مہارت سے شعر کو پُر تاثیر بنانا ہر کسی کے بس میں نہیں۔

ارژنگ: آپ اکیسویں صدی کی شاعری میں جدت طرازی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ایوب ندیم: ذرا رکیے! یہ جدت طرازی ہے کیا؟ ہر دور کی شاعری اپنے زمانے کے مطابق ہوتی ہے۔ میرؔ کا دور ولی دکنی کے عہد کے مقابلے میں جدید تھا۔ غالبؔ کا زمانہ میرؔ کے مقابلے میں جدت طراز تھا۔ پھر اقبالؔ اور فیضؔ کی دُنیا غالب کی دنیا کی نسبت نئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ہماری شاعری کئی مراحل سے گزری ہے۔ اکیسویں صدی تک آتے آتے سیاسی اور سماجی حالات میں کئی موڑ آ چکے تھے۔ جن شاعروں نے نئے مضامین کو اختیار کیا آپ اُنھیں جدت طراز کہہ سکتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عہد حاضر کی شاعری میں مجھے گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آتی۔ آج وہ شاعر مقبول ہیں جو مزاح نگار ہیں یا نوجوان کے

جذبات سے کھیلنے کے لیے شعر کہتے ہیں۔ ایسی شاعری کا مقصد صرف شہرت کا حصول رہ گیا ہے۔ تعلیمی اداروں اور اس طرح کے دیگر فورمز کے مشاعروں میں ہونے والی واہ واہ نے شاعر کو بڑی بات کہنے سے محروم کر دیا ہے۔ ہم سب اس کا شکار ہیں۔ اگر ایسی شاعری نہ کریں تو داد نہیں ملتی اور اگر داد نہ ملے تو مشاعرہ پڑھنے کا فائدہ، البتہ کبھی کبھی کوئی ایسا شعر سننے کو مل جاتا ہے جس میں واقعی کوئی ایسی بات ہو جس کا اثر تادیر قائم رہے۔

ارژنگ: قدیم اور جدید شعراء میں آپ کے کون کون پسندیدہ ہیں اور کیوں؟

ایوب ندیم: پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعر نہ قدیم ہوتا ہے اور نہ جدید۔ شاعر، شاعر ہے، وہ کسی بھی عہد کا ہو۔ میرے نزدیک میرؔ، دردؔ، آتشؔ، غالبؔ، داغؔ، کوئی بھی پرانا نہیں۔ پرانے صرف وہ ہیں جو آج بھی ''لب و رُخسار'' کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آج کے زمانے میں بھی قدیم شاعروں کی کمی نہیں اور پرانے ادوار میں بھی جدید شاعر تھے۔ رہا یہ سوال کہ مجھے کون کون پسند ہے، چند نام تو پہلے ہی لے چکا ہوں۔ ان کے ساتھ آپ حسرتؔ، راشد، ناصرؔ اور منیرؔ کو بھی شامل کر لیجیے۔

ارژنگ: نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ایوب ندیم: آپ نے یہ بڑا نازک سوال کیا ہے۔ نازک اس لیے کہ کئی احباب پر گراں گزرے گا۔ میں نے بہت پہلے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ نثری نظم ہماری شاعری پر ایک ڈرون حملہ ہے۔ اس بات پر میں آج بھی قائم ہوں۔ آپ اسے ''نثریہ'' کہہ سکتے ہیں، نظم نہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں نظم سے مراد وہ منظوم شاعری ہے جو کسی بحر کی پابند ہو۔ اُردو اور فارسی میں ہر لفظ کا حرف حرف بولتا ہے۔ یہ سہولت انگریزی اور کئی دیگر مغربی اور ایشیائی زبانوں کو حاصل نہیں، نثری نظم یا نثریہ اُن کی ضرورت تو ہے، ہماری کیسے ہوگئی، جب کہ ہمارے ہاں عروض کا باقاعدہ نظام موجود ہے اور کم از کم تین صدیوں سے اس کے مطابق شاعری ہو رہی ہے۔ آپ کو یقیناً کئی شعر اور مصرعے یاد ہوں گے۔ آپ انھیں اپنی گفتگو میں دہراتے بھی ہیں، کسی نثریے یا نثری نظم کی ایک سطر بھی کسی کو یاد ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ صنف تاثیر سے خالی ہے اور جس میں تاثیر نہ ہو وہ شاعری کیسے ہو سکتی ہے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعری کی مقبولیت اور اس کے بدلتے جدید انداز زمانے کے ہاتھ میں ہیں؟

ایوب ندیم: بالکل ایسا ہی ہے۔ ہر زمانے کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔ یعنی اُس عہد کے لوگوں کے احساسات، جذبات اور خیالات کا عکس۔ مقبولیت کے انداز اور معیارات بدلتے رہتے ہیں لیکن بڑی شاعری کے معیارات کچھ اور ہیں۔

ارژنگ: شاعری سے زیادہ اور کیا خوبصورت ہے؟

ایوب ندیم: کیا خوب صورت سوال ہے! شاعری سے زیادہ دل کش غالباً وہ شخصیت ہوتی ہے، جس کے لیے ہم شعر کہنا شروع کرتے ہیں، مگر جوں جوں شاعری کا یہ سفر آگے بڑھتا ہے وہ شخص پیچھے رہ جاتا ہے، لیکن پس منظر سے شاید کبھی غائب نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''چاند میرا ہم سفر'' مطبوعہ 1998ء کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔ شاعری میری پہلی محبت ہے۔ مجھے آج بھی شعر کہنے سے جو سرشاری ملتی ہے، وہ کسی اور ادبی کام سے حاصل نہیں ہوتی۔ مگر محبت کا بہتا ہوا دریا کہیں رُکتا نہیں۔ جھرنوں سے نکلتا ضرور ہے، لیکن آگے چل کر نئی منزلوں سے آشنا ہوتا ہے۔

ارژنگ: اردو ادب میں تنقید کے معیار سے لوگ کتنے مطمئن ہیں؟

ایوب ندیم: تنقید! کہاں رہ گئی ہے تنقید؟ کہیں ہے تو بتائیے۔ فلیپ اور دیباچے تعریفی اسناد ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ جس کتاب پر دیباچہ لکھا جاتا ہے اُس کا تجزیہ بھی نہیں کیا جاتا کہ چلو تعریف ہی سہی، اس کا کوئی جواز بھی تو ہو۔ البتہ تنقید کے نام پر مغرب سے بعض درآمد شدہ تنقیدی اور اصطلاحات کے اُردو ترجمے پیش کیے جا رہے ہیں، جو لوگوں کو تو کیا خود مترجم کو بھی سمجھ نہیں آتے۔ تنقید کی ان جدید اصطلاحات کا اطلاق کہاں ہوتا ہے؟ یہ ایک الگ سوال ہے جس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں۔

ارژنگ: غزل مکمل رومانوی صنف ہے۔ کیا زندگی کے دیگر مسائل اور سائنسی موضوعات اس کے حسن کو متاثر نہیں کر رہے؟

ایوب ندیم: جیسا کہ میں نے پہلے کہا دریا کا نقطۂ آغاز دریا نہیں ہوتا۔ اسی طرح غزل کو محض رومانوی صنف کہہ دینا مناسب نہیں۔ رومان اس کا آغاز ہے۔ اب تو یہ دریا کم از کم تین صدیوں سے بہتا ہوا بہت دور نکل آیا ہے۔ نئے مضامین اس کی وسعت کا باعث بن رہے ہیں، اس کے حُسن کو متاثر نہیں کرتے۔

ارژنگ: غزل اور نظم میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو آپ کس کا انتخاب کریں گے؟

ایوب ندیم: ظاہر ہے غزل کا۔ غزل ایک ایسے گلستان کی طرح ہے، جس میں مختلف رنگوں کے پھول کھلے

ہوں۔ غزل میں یکسانیت نہیں، غزل کے ایک شعر میں وہ مضمون بیان کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے عموماً نظم کو کئی مصرعے درکار ہوتے ہیں، تاہم مجھے آزاد نظم بھی پسند ہے۔ میں کبھی کبھی سانیٹ بھی لکھتا ہوں اور نظم معرا بھی، لیکن غزل میں جو لطف ہے وہ شاید کسی اور صنف سخن میں نہیں۔ شہرت بخاری کہا کرتے تھے ''مجھے پھلوں میں آم اور آموں میں سہارنی آم بہت پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کی خوش بو اور ذائقہ ہوتا ہے، غزل میں بھی مجھے وہی خوش بو اور ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔''

ارژنگ: 80ء کی دہائی میں شعرا کے ہاں اسلوب کی جدت دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے باوجود شعراء نے کافی مقبولیت بھی حاصل کی۔ آپ کیا کہیں گے؟

ایوب ندیم: 80ء کی دہائی کا ایک شاعر میں بھی ہوں۔ جدت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ مجھے نہیں معلوم، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر اپنے زمانے میں جدید ہوتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی شاعری کرے، محض کلاسیکی دور کی پیروی میں نہ اُلجھا رہے۔ باقی رہی مقبولیت تو اُس کے کئی ہتھکنڈے ہیں۔ تعلیمی اداروں اور نوجوانوں کے حلقوں میں لابنگ کرنا، داد لینے کے لیے اپنے اپنے گروہ بنانا، سوشل میڈیا پر لگے رہنا، سطحی جذبات پر مبنی شاعری کرنا، جس سے نوجوان متاثر ہوں بعض بیرونِ ملک مقیم لوگوں کے خالی صفحات پر اصلاح دے کر اُن کی کتابیں چھپوانا اور پھر اس احسان کے بدلے میں وہاں جا کر مشاعرے پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ 80ء کی دہائی کے بعض شاعر ان طریقوں سے چوں کہ بخوبی واقف تھے، چناں چہ انھوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ مگر اس کا آغاز تو 70ء کی دہائی میں ہی ہو چکا تھا، جب اخبارات میں ادبی صفحات کی ابتدا ہوئی تو ان کے انچارج راتوں رات بین الاقوامی شاعر بن گئے۔ اس کلچر کو فروغ دینے والوں نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔

ارژنگ: ہندوستان اور پاکستان کے ادب خصوصاً شاعری میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟

ایوب ندیم: دونوں ملکوں کے اپنے اپنے حالات ہیں، چناں چہ مضامین میں بھی تھوڑا بہت فرق ہے۔ مگر طرزِ احساس میں نہیں، لفظیات میں اشتراک ہے۔ البتہ ایک فرق نمایاں ہے اور وہ یہ ہے کہ بھارت کے قریب قریب ہر اہم شاعر کا لہجہ الگ ہے، اُس کا اسلوب اپنا ہے، مضامین میں بھی قدرے فرق دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان میں ایک دوسرے کی تقلید کا رجحان عام ہے۔ بعض اوقات تو کسی مشاعرے میں دس پندرہ شاعروں کو سننے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی شاعر کو سنا ہے۔ لہجے، اسلوب اور لفظیات تک میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پاکستان میں منفرد لہجے بنانے والے شاعر گزر گئے۔ فیضؔ، ندیمؔ، قتیلؔ، منیرؔ، ناصرؔ، جون ایلیا، سب اپنے لہجے سے پہچانے جاتے تھے۔ یہ وصف امجد اسلام امجد میں بھی تھا۔ ان کے بعد مقبولیت تو ہے، انفرادیت نہیں۔

ارژنگ: کیا آپ کے خیال میں نثری نظم کے بعد آزاد اور پابند نظمیں پس منظر میں جا رہی ہیں؟

ایوب ندیم: ظاہر ہے نثر یہ لکھنے میں آسانی ہے۔ پابند اور آزاد نظم میں بحر کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اب لوگ سہل پسند ہو گئے ہیں۔ نئے لکھنے والے کارِ دُشوار سے گھبراتے ہیں اور نثر یے لکھ کر شاعروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سراسر زیادتی ہے۔ ادبی جرائد کے مدیران کو چاہیے کہ وہ باوزن اور بے وزن شاعری میں تفریق کریں۔ اپنے رسالوں میں ان کے الگ الگ حصے بنائیں تاکہ پڑھنے والا نظم اور نثر یے میں امتیاز کر سکے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں پڑھائی جانے والی تنقید مغربی تنقید ہی کا چربہ ہے؟

ایوب ندیم: میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے، جو آپ نے کہا، حقیقت ہی یہی ہے۔ مغرب کے تنقیدی نظریات ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُردو میں منتقل کیے جا رہے ہیں۔ شروع میں بعض نظریات ایسے ضرور تھے، جن کا ہمارے ادب پر اطلاق کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا بھی رہا ہے، لیکن بعد کے بیش تر نظریات و تصورات محض پڑھنے پڑھانے کی حد تک ہیں۔ اس کے سوا ان کا کوئی مقصد نہیں۔ مثال کے طور پر عمرانی، نفسیاتی اور مارکسی تنقید کے بعد جو مغربی تنقیدی نظریات ہمارے ہاں آئے ہیں، آپ ہی بتائیے ان کا اطلاق کس کس فن پارے پر کیا گیا ہے۔

ارژنگ: تقسیم کے بعد لکھی جانے والی تنقید نے ہمارے ادب پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

ایوب ندیم: تقسیم کے بعد بھی کچھ برسوں تک ہمارے ہاں اچھی تنقید لکھی گئی۔ سماجی حالات، انسانی نفسیات اور فن کے حوالے سے ادبی تخلیقات کو پرکھنے والے نقاد موجود تھے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، حسن عسکری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو کون بھول سکتا ہے۔ یقیناً کچھ اور نام بھی ہیں جو پاکستان میں تنقید کی پہچان ہیں مگر جب سے تنقید کی جگہ ستائش نے لی ہے اور نام نہاد تنقید محض

فلیپ اور دیباچے تک محدود ہوئی ہے، اس کی موت واقع ہوگئی ہے۔ بلکہ اب تک تو کئی برسیاں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ نقد و انتقاد کی موت کا ہی نتیجہ ہے کہ ادب کے نام پر نہ جانے کیا کیا لکھا جا رہا ہے۔ ناول، افسانہ اور شاعری وغیرہ کی ایسی کتابیں چھپتی ہیں، جن میں نہ ناول ہوتا ہے، نہ افسانہ اور نہ شاعری، لیکن ان کتابوں کی پذیرائی محفل در محفل ہوتی ہے۔

ارژنگ: موجودہ دور میں غیر اخلاقی اور فحش ادب کیوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے؟ یہ تصور کہاں سے فروغ پایا؟

ایوب ندیم: یہ سب غیر معیاری ادب ہے۔ غیر اخلاقی موضوعات کو بھی سلیقے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہنرمندی کا کام ہے اور یہ ہنرمندی اب نہیں رہی۔ لکھنو کے شاعر بھی بہت کچھ کہتے تھے اور اُن میں ایسے بھی تھے جو صنائع بدائع کے پردے میں لکھتے تھے۔ مگر اب بعض لوگ ایسے ادب کو مقبولیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ سب عارضی باتیں ہیں۔ ایسا ادب آتش بازی کی طرح ہوتا ہے جو وقتی طور پر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور پھر راکھ ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: سوشل میڈیا نے سنجیدہ ادب کو کتنا متاثر کیا ہے؟

ایوب ندیم: سوشل میڈیا نے تو سنجیدہ ادب کا جنازہ نکال دیا ہے۔ بے تکی اور بے وزن شاعری مقبول ہو جاتی ہے۔ گھٹیا باتوں پر لائکس ملتی ہیں۔ اکثر مزاحیہ شاعر بھانڈوں کی طرح محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ انھیں مشاعرہ پڑھنے کا بھاری معاوضہ بھی ملتا ہے اور جو اصل شاعر ہے وہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غیر سنجیدہ ادب کا سب سے بڑا نقصان نئی نسل کو ہو رہا ہے۔ وہ اچھا شعر سننے اور اس پر داد دینے کے قابل ہی نہیں رہے۔ کیوں کہ بازاری شاعری نے انھیں معیاری شاعری کے تصور سے بے گانہ کر دیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا حتیٰ کہ سرکاری ٹی وی بھی یہی کام کر رہا ہے۔ یہ شاعری کے انحطاط کا دور ہے۔ جو شاعر ان حالات میں بھی اس زمین کو زرخیز رکھے ہوئے ہیں وہ یقیناً لائق ستائش ہیں۔

ارژنگ: کیا ادیب اور شاعر جھوٹ اور منافقت سے بھی کام لیتے ہیں؟ آپ کا مشاہدہ کیا ہے؟

ایوب ندیم: جھوٹ اور منافقت تو اب ہمارے معاشرے کا ''زیور'' بن گئے ہیں۔ یہ کام صرف ادیب اور شاعر ہی نہیں کرتے، سب کرتے ہیں۔ دفتروں میں، مارکیٹوں میں کیا ہوتا ہے۔ میں نے ایک پروفیسر کی حیثیت سے عمر گزاری ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی بہ ظاہر وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو خوشامد اور منافقت میں آگے ہوتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے مفاد کے لیے دوستوں کو ڈسنے سے بھی باز نہیں آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ خود غرضی عام ہے۔ سچائی اور اخلاص کے لفظ صرف کتابوں میں لکھنے کے لیے ہیں، معاشرے میں ان کی کوئی قدر نہیں۔ یہی حال ادیبوں اور شاعروں کا ہے۔ پاک ٹی ہاؤس میں بعض ادیب اس لیے بھی اپنی میز نہیں چھوڑتے کہ بعد میں اُن کی غیبت ہوگی۔ میرے اپنے تجربات اس حوالے سے خاصے تلخ ہیں۔ میں نے بعض ایسے ادیبوں پر بھی ایم فل کے تحقیقی مقالے لکھوائے، جنھیں جامعات نے برس ہا برس نظر انداز کیا۔ ایک مرحوم ادیب کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ میں نے ان کے ساتھ اس ناروا سلوک کے ازالے کے لیے ان پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھوایا۔ پھر کیا تھا جونہی مقالہ مکمل ہوا، وہ مجھ سے نظریں چرانے لگے۔ ایک اور صاحب کا قصہ بھی سن لیجیے۔ ماشاء اللہ حیات ہیں۔ ان کی ظاہری محبت کو دیکھتے ہوئے میں نے ان پر تھیسز کروانے کا فیصلہ کیا۔ وہ میری ادبی خدمات کے بہت معترف تھے۔ مجھے ان کا موضوع منظور کرانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ ان کے حوالے سے بورڈ آف سٹڈیز کو تحفظات بہت تھے۔ بہر حال تھیسز مکمل ہو گیا۔ ایک جگہ کہیں میرا نام آیا تو وہ وہاں رائے کا حق رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے میری خوب مخالفت کی۔ یہ ہے منافقت کا معیار۔ مگر میں سوچتا ہوں ہم قومی سطح پر بھی اپنی نئی نسل کو کیا سکھا رہے ہیں؟ خود غرضی، بددیانتی، دھونس اور دھاندلی ہم یہ نہیں سوچتے کہ کل ہم وہی کاٹیں گے جو آج بو رہے ہیں۔

ارژنگ:

ایوب ندیم: پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر نئے لکھنے والے شاید کوئی پیغام سننا ہی نہیں چاہتے۔ مشاعروں میں آتے ہیں تو شروع میں ہی اپنا اُلٹا سیدھا کلام سنا کر چلے جاتے ہیں۔ سینئرز کو سننا پسند نہیں کرتے۔ اصلاح کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ مکالمہ کرتے نہیں۔ پھر بھی میں ان سے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ سیکھنے کی طرف آئیں۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تدبیر، ان تین وسیلوں سے ذہن و دل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس لیے جس قدر ممکن ہو ان وسیلوں سے اپنے ذہن کو روشن اور دل کو سیراب کریں۔ علم کے موتی جہاں سے ملیں، اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ علم اور فن میں تونگر بننے کا یہی ایک راستہ ہے۔

احمد ندیم رفیع

شاعری میں جذباتی گہرائی اور صداقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آفاقی شاعری وہ ہوتی ہے جو مختلف ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب کے درمیان بات چیت اور سمجھ بوجھ کو فروغ دے اور عالمی اور انسانی اقدار کی عکاسی کرے۔ اردو شاعری میں لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب اہم ہوتی ہے۔ اچھی شاعری میں لفظوں کی خوبصورتی اور ان کا معنی خیز استعمال نمایاں ہوتا ہے۔

اک توازن ہے یہ الفاظ و معانی کے بیچ
شاعری نام نہیں قافیہ پیمائی کا

سوال: آپ کے شب و روز کے معمولات کیا ہیں۔ اب کے لیے کتنا وقت ملتا ہے؟

جواب: شعبۂ طب سے منسلک ہوں جس کی وجہ سے میرے شب و روز پیشہ ور مصروفیات سے جڑے رہتے ہیں۔ شعر و ادب کے لیے وقت ملتا نہیں بلکہ نکالنا پڑتا ہے۔ آرکنساس امریکہ میں رہتے ہوئے بھی یہاں شعر و ادب کی شمع جلائی ہوئی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی ایلومنائی کے تعاون سے اپنے شہر میں کئی مشاعروں کا اہتمام کیا جس میں انڈیا اور پاکستان کے کئی معروف شعراء نے شرکت کی۔

سوال: زندگی ہر موڑ پر انسان کوئی سبق سکھاتی ہے۔ آپ کی زندگی میں کوئی سبق آموز واقعات ہیں تو شیئر کیجیے تاکہ قارئین استفادہ کر سکیں۔

جواب: میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا ضرور چاہتا تھا لیکن کوئی وسائل نہیں تھے۔ اس لیے اس بارے زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ ایک دوست نے آئرلینڈ کی میڈیکل رجسٹریشن کی فیس جمع کروا دی اور وہاں سے خط لکھا کہ ٹکٹ کٹاؤں اور آ جاؤں۔ اس ایک واقعے نے میری زندگی کا دھارا ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال آئرلینڈ میں بہت آسودہ حالی میں گزارے اور اس دوران بہت سے ڈاکٹروں کو وہاں آنے اور جاب دلانے میں مدد کی۔ سبق یہ ہے کہ آپ لوگوں کی زندگی میں آسانیاں پیدا کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں بھی آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

سوال: مناظر فطرت میں آپ کو کون سے منظر زیادہ پسند ہیں اور کیوں؟

جواب: مجھے موسموں کا تغیر بہت لبھاتا ہے۔ گرمی، سردی، بہار اور خزاں پر موسم اپنے ساتھ خصوصی قدرتی مناظر لاتا ہے۔ جیسے بہار میں پھولوں کی بوقلمونی، گرما میں گھاس کی ہری بھری چادر، خزاں میں پتوں کا رنگ بدلتا پیرہن اور سرما میں برف کا غلاف یہ مناظر نہ صرف خوبصورت ہوتے ہیں اور بلکہ انسانی جذبات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

سوال: آپ کے نظریات کا آپ کی شاعری میں کتنا عمل دخل ہے۔

جواب: میں شاعری کو انفرادی تجربات، جذبات اور تخیل کے آزادانہ اظہار کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ مخصوص نظریاتی وابستگی اظہار کی آزادی کو محدود کر سکتی ہے۔ میرے نزدیک رنگ و نسل، ثقافت اور مذہب کی تخصیص کیے بغیر باہمی محبت اور انسان دوستی کا پرچار ہی سب سے بڑا نظریہ ہے۔

سوال: معاشرے میں ایک مثالی ادیب کی آپ کے نزدیک کیا خوبیاں ہیں۔ کیا ہمارے ہاں اس کی مثالیں موجود ہیں یعنی کون سے ادیب ان پر پورا اترتے ہیں۔

جواب: مثالی ادیب کو وسیع معلومات اور گہری معرفت کا حامل ہونا چاہیے، جس میں زبان، ادب، تاریخ، فلسفہ اور دیگر معاشرتی علوم شامل ہیں۔ علم انہیں اپنی تخلیقات میں معنویت اور گہرائی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تنقیدی سوچ اور تخلیقی صلاحیت کے علاوہ ایک مثالی ادیب کی تحریروں میں معاشرتی آگاہی، ایمانداری اور سچائی کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ معاشرے میں انسانیت کے احترام کو فروغ دینا بھی ایک مثالی ادیب کی خوبی ہوتی ہے۔ ادب کی دنیا مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ایک مثالی ادیب وہ ہوتا ہے جو مسلسل سیکھنے، اپنے آپ کو بہتر بنانے اور نئی ادبی تکنیکوں اور پیرایۂ اظہار کو آزمانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد فیض احمد فیض، ن م راشد، ناصر کاظمی اور مجید امجد نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے اردو شاعری کو نئی جہتیں بخشیں۔ ان لوگوں کی شاعری میں عشق، حسن، فلسفہ اور معاشرتی تبدیلیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ خواتین میں پروین شاکر کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے عورت کے جذبات، احساسات اور تجربات کو بڑی خوبصورتی اور سچائی سے پیش کیا۔

سوال: آپ تنہائی پسند ہیں یا محفل کے آدمی ہیں؟

جواب: میں بنیادی طور پر تنہائی پسند ہوں۔ اگرچہ انسان معاشرتی مخلوق ہے اور ان سے اسے دوسروں کے ساتھ وقت گزارنے کی ضرورت ہوتی ہے، تاہم اکیلے وقت گزارنے سے آپ کو اپنی ذاتی دلچسپیوں اور شوق کو تلاش کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملتا ہے جو ذاتی ترقی کی راہ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ تنہائی آپ کو خود کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع دیتی ہے۔ آپ اپنے جذبات، افکار اور زندگی کے اہداف پر زیادہ گہرائی سے غور کر سکتے ہیں۔ بہت سے مصور، موسیقار اور لکھاری تنہائی کو تخلیقیت میں اضافے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ اکیلے وقت

گزارنے سے تخلیقی سوچ کو فروغ ملتا ہے۔

سوال: آپ مسیحائی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ کیا اس کے تجربات و مشاہدات غزل کا حصہ بن پائے؟

جواب: ہر حساس شخص اپنے اردگرد کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میڈیکل پیشہ انسان جذبات، دکھ اور جینے کے تجربات کی ایک وسیع رینج کو سامنے لاتا ہے جو کہ اعری کے لیے زرخیز مواد فراہم کرتا ہے۔ موت، بیماری اور بحالی کے تجربات جذباتی گہرائی اور انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کا ذریعہ بنے۔ بحیثیت شاعر میں زندگی اور موت کے سوالات، اخلاقیات اور فلسفہ پر غور کرنے کے لیے مجبور ہوا۔ میڈیکل سائنس اور شاعری دونوں، اپنے اپنے طریقے سے، دنیا کی تفہیم اور تجربے کے ایک مخصوص زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ایک میڈیکل ڈاکٹر جو شاعر بھی ہو، وہ ان دونوں عالموں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتا ہے۔

سوال: ویسے تو بقول غالب ''ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب'' آپ کی تین بڑی خواہشات کون سی ہیں؟

جواب: میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ پاکستان کو اپنی زندگی میں ایک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں دیکھ سکوں لیکن یہ بھی اب ایک دیوانے کا خواب لگنے لگا ہے۔

جس پہ چل کر کبھی منزل پہ نہیں پہنچے ہم
اسی رستے پہ سفر بارِدگر کیا معنی

دوسری بڑی خواہش یہ ہے کہ کاش یہ دنیا امن و امان کا گہوارہ بن سکے۔ پچھلی چار دہائیوں میں ہونے والی جنگوں میں بے گناہ انسانوں کا اتنا خون بہا ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میری رائے میں مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان تفاہم اور احترام میں اضافہ کر کے تنازعات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ معاشی استحکام اور عدل پر مبنی نظام دنیا میں امن کی بنیاد ہو سکتے ہیں کیونکہ اکثر تنازعات کی جڑیں معاشی مسائل میں ہوتی ہیں۔ تیسری بڑی خواہش یہ ہے کہ پاکستان واپس آ کر آباد ہو سکوں۔ بدقسمتی سے میرے جاننے والوں میں جتنے ڈاکٹر بھی پاکستان واپس گئے چند سال بعد مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔ جس معاشرے میں انصاف نہ ہو وہاں رہنا کسی جہاد سے کم نہیں۔

سوال: کبھی ادبی پرچہ شائع کرنے کا خیال آیا؟

جواب: اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ البتہ میڈیکل کالج میں بطور مدیر کچھ میگزین میں کام کیا۔ امریکہ میں پاکستان ڈاکٹروں کی تنظیم اپنا (APPNA) کے میگزین کے اردو سیکشن کے لیے بطور مدیر کام کیا۔ اس کے علاوہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل امریکہ کی المنائی (KEMCA) کے میگزین کی ادارت بھی سنبھالی۔

سوال: اگر روزگار کے اچھے مواقع میسر ہوں تو آپ کہاں رہنا چاہیں گے پاکستان یا امریکہ؟

جواب: یقیناً پاکستان میں، خیال تو یہی ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان منتقل ہو جاؤں بشرطِ زندگی۔

سوال: ماہنامہ ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام۔

جواب: ایک معیاری ادبی رسالہ نکالنا بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ سب سے پہلے تو ماہنامہ ارژنگ کے منتظمین اور ادارے کو سلام جنہوں نے ان مشکل حالات میں بھی بغیر کسی اشتہاری معاونت کے اس شمع کو پچھلے چوبیس سال سے جلا رکھا ہے۔ میری قارئین سے یہی درخواست ہے کہ سالانہ خریدار بن کر اس رسالے کی کامیابی میں اپنا حصہ ڈالیں۔

بہار کی ایک نظم

بہار کی ایک نظم
زندگی کٹھن تو ہے
بے وطن پرندوں کی
بے زمین پودوں کی
اپنے دیس سے بچھڑے
بدنصیب لوگوں کی
پھر بھی جب بہار آئے
سب پرندے شاخوں پر
چہچہانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں
کم نصیب شاخوں پہ
بے وطن مسافر بھی
مہرباں ہواؤں سے
غم کو بھول جاتے ہیں
چاہے چند لمحے ہی
جب بہار آئی ہے
معجزے دکھاتی ہے

عامر بن علی

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا
اک اشارہ تھا کسی آنکھ کے رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصلِ منزل رکھا
جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا
اُس نے کشکول میرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رَب نے مجھے سائل رکھا
ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنیٰ
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں، وہیں دل رکھا

لبنیٰ صفدر

کھوکھلی دیوار

عذرا اصغر

میرے اور اس کے چھوٹے سے گھر کو پختہ اینٹوں سے بنی چھ فٹ اونچی دیوار تقسیم کرتی ہے۔ دیوار اگرچہ پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوئی ہے مگر خود پختہ نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا اسے پل بر میں ملبے کا ڈھیر بنا دے گا۔ مگر ایسا ہوا کبھی نہیں۔ سینکڑوں آندھیاں آئیں۔ پچاسوں طوفان گزرے مگر یہ دیوار یونہی کھڑی میرے شکوک کا مذاق اڑاتی رہی۔ اس کی پختہ اینٹیں جگہ جگہ سے بھربھری ہو کر دیوار کے کھوکھلے پن کا اظہار کر رہی ہیں۔ کئی جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ اینٹوں کے درمیان سے سیمنٹ نکل بھاگا ہے۔ یہ انکشاف مجھے پر اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنے گھر کے آنگن میں، بجلی بجھائے بل ادا کرنے کے خوف کو افسانے کا پلاٹ سوچنے کا بہانہ بنا کر، سرکنڈے کے پرانے ٹوٹے ہوئے موڑھے پر بیٹھا بگلے کا سستا سگریٹ انگلیوں کے بیچ دبائے بزعمِ خود بہت انٹلکچوئل بنا پھیپھڑوں میں کینسر کو دعوت دے رہا ہوتا ہوں۔ تب یہ سوراخ جگنوؤں کی طرح چمکے ہیں اور دیوار کی خستگی کا احساس میرے اندر بڑھ جاتا ہے۔

گزشتہ چھ سال سے میں اس چھوٹے سے گھر میں بطور کرایہ دار جی رہا ہوں۔ میرا ہمسایہ مجھ سے ذرا بعد ادھر آ کر آباد ہوا تھا۔ تب وہ ایک اکیلا شخص تھا اور شاید کسی مِل میں کام کرتا تھا۔ یہ تو میں نے ازرہِ تکلف کہا ہے۔ یا انکسار سمجھ لیجئے کیونکہ میں کسی کی ہتک پسند نہیں کرتا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک مِل مزدور تھا اور ابھی تک ہے۔ شروع کے دو چار دن تو میں اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک روز وہ خود ہی میرے پاس چلا آیا۔ اسے ٹارچ کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اور مجھے وہ بہت مؤدبانہ انداز میں ''بابو صاحب'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے ٹارچ نہ ہونے پر معذرت چاہی تو وہ حیرانی سے بولا۔

''بابو صاحب! بڑے آدمیوں کے پاس تو یہ چیزیں ضرور ہوتی ہیں مگر آپ کیسے بڑے آدمی ہیں کہ ایک ٹارچ بھی نہیں رکھتے.....؟''

میں نے اپنی ناداری کے رکھ اور پشیمانی کے احساس کو بڑے فنکارانہ انداز سے ہنسی میں چھپا کر جواب دیا۔

''بھائی یہ تم نے کیسے جانا کہ میں بڑا آدمی ہوں اور پھر یہ کس طرح سوچ لیا کہ ٹارچ صرف بڑے آدمی ہی رکھتے ہیں؟ میں تو ایک غریب سا افسانہ نگار ہوں کہانی کار۔''

وہ خوش ہو کر بولا ''پھر تو آپ بہت ہی بڑے آدمی ہیں۔''

میں نے بات ٹال دی اور اس کے یقین کو زک نہیں پہنچائی۔ اسے میں کیا سمجھاتا..... کیا بتاتا؟ میر نے کہا۔

''سنو! میرا کام لکھنے پڑھنے کا ہے۔ سو تمہیں کاغذ، قلم یا پنسل کی ضرورت ہو تو چلے آنا۔''

اپنے ہمسائے سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کی ڈیوٹی کے اوقات بدلتے رہتے تھے اور میری زندگی کی ہی کوئی اوقات نہ تھی۔ میں دو دو وقت کے فاقے سے بیٹھا بگلے کے سگریٹ پھونکتا رہتا۔ خالی پیٹ دفتروں کے چکر کاٹتا اور مایوس ہو کر گھر کے ویرانے میں لوٹ آتا۔ کہیں سے کسی مضمون یا افسانے کا معاوضہ مل جاتا تو چار دن اچھے کٹ جاتے۔ ورنہ پھر وہی چکر..... اور اس دن بھی بجلی کا اکلوتہ بلب بجھائے میں اپنے گھر کے مختصر ترین آنگن میں سرکنڈے کے موڑھے پر بیٹھا بڑے مزے میں سگریٹ پی رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

''کون ہے.....؟'' ادھر سے آواز آئی۔

''میں عبدالرحمان ہوں بابو صاحب.....''

میں اس کا نام نہ جانتا تھا مگر سمجھ گیا کہ میرا ہمسایہ ہے۔ اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آ گیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔

''بابو صاحب آپ تو بہت بڑے شاعر ہیں؟ آپ نے تو مجھے بتایا ہی نہیں تھا.....؟''

اسے گویا مجھ سے شکایت تھی۔ میں بھلا کیا جواب دیتا بس مسکرا کر رہ گیا اور اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ نہ دیکھ سکا کہ میری مسکراہٹ میں زمانے کے لگائے ہوئے کتنے نشتر تھے۔ معاشرے کے بخشے ہوئے کتنے فاقے نوحہ کناں تھے۔ حالات کے لگائے ہوئے کس قدر زخم مچلتے تھے۔ وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ اور تاریکی نے پھر پردہ رکھ لیا۔ میں اس کی نظر میں بڑا آدمی ہی بنا رہا۔ میں عبدالرحمن کی نظروں سے گرنا بھی تو نہ چاہتا تھا۔ میرے دل سے اندھیرے کے لئے دعا نکلی۔ ذرا توقف کے بعد وہ پھر بھولا۔

''آج میرے ایک دوست نے ایک اخبار میں چھپی آپ کی تازہ نظم پڑھ کر سنائی۔ وہ بتا رہا تھا جی کہ آپ نے تو زبردست سوشلسٹ ہیں اس کے لہجے میں تعجب تھا۔ اچنبھا تھا، مسرت تھی۔ وہ بولتا رہا۔

''مزدوروں کے حق میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ واقعی جی ملوں کے مالکان ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ آپ صحیح فرماتے ہیں جی کہ پیسہ ان کا ہے تو کیا ہوا۔ محنت تو ہماری ہے ناں؟ ہم کام نہ کریں تو سب مشینیں کھڑی ہو جائیں گی سالیاں۔ تمام کاروبار چوپٹ ہو جائے۔ تب پتہ لگے ان سیٹھوں کو۔ ان کی مشینوں کو تو ہم اپنے خون پسینے سے چالو رکھتے ہیں جی۔ اور آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ تو ہماری آنکھیں کھولتے ہیں۔ ورنہ جی ہم جاہل، غریب لوگ کیا جانیں یہ سب کیا گھپلا ہوتا ہے۔''

وہ کہتا رہا اور پہلی بار میں بڑے باغیانہ انداز میں اس کی گفتگو کے برعکس سوچتا رہا۔ چند روز پہلے ہی تو

میرے ایک دوست نے کہا تھا۔

''یار تم شاعر ادیب لوگ جو دولتمندوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہو تو یہ بتاؤ اگر یہ لوگ سرمایہ نہ لگائیں، کارخانے نہ بنائیں، کروڑوں روپیہ خرچ کر کے باہر سے مشینیں نہ منگائیں تو تمہارا مزدور کس چیز پر محنت صرف کریگا؟ مزدوروں کیلئے تم لوگ بے حار[illegible] جاتے ہو مگر تم نے کبھی اپنے طبقے کا محاسبہ نہیں کیا؟ [illegible]تہ مظلوم ہے۔ صحیح معنوں میں بے کس ہے۔ چکی کے دو پاٹوں بیچ کچلا جا رہا ہے۔ اس کے بارے میں اس کے لیے تم لوگ کچھ نہیں بولتے؟''

بات سوچ بھی مگر اس وقت سچائی کی۔ کڑوی گولی میں نگلنے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ میں نے کہا۔

''سنو دوست! سرمایہ دار مشینیں منگاتے ہیں پر مزدور دستیاب نہ ہوں تو کیسے چلیں گے ان کے کارخانے؟ سوال یہ ہے کہ وہ جتنا منافع کماتے ہیں اسی حساب سے مزدور کی محنت کا معاوضہ بھی تو ادا کریں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مختصر سرمایہ لگانے سے تو ان کے میل میل بھر لمبے بنگلے بن جائیں۔ ایک سے دس کارخانے کھڑے ہو جائیں اور محنت کش کو ایک جھونپڑا بھی نصیب نہ ہو۔ اس کی قسمت میں فاقے ہی رہیں؟ اس کی اولاد نہ خواندہ رہے؟''

تب میرے دوست نے پھر کہا۔ ''جو خطِ تفریق قدرت نے خود کھینچ دیا ہے اسے تم کیسے مٹا سکتے ہو؟ اس طرح تم اضطراب تو پیدا کر سکتے ہو مگر سب کو ایک جیسا نہیں بنا سکتے۔ یہ کوشش قدرت سے بغاوت ہے۔'' اس کا نظریہ تھا کہ جو جتنی عقل رکھتا ہے، علم حاصل کرتا ہے، اسی قدر اسے زیادہ سہولت ملنی چاہئے، بہتر مراعات ہونی چاہئیں۔ اس نے بڑے جوش سے کہا تھا۔

''ایک عام گھرانے کا بچہ پانچ سال اور بعض تین سال کی عمر سے پڑھنا شروع کرتا ہے اور اٹھارہ بیس برس تک علم حاصل کرنے میں جتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی عمر کا بہترین حصہ حصولِ علم میں گزار دیتا ہے اور زندگی کی ہر سیر و تفریح سے محروم رہتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ جب وہ چاہتا ہے کہ اب اسے اس کی محنت شبانہ و روز کا صلہ ملے۔ علم کا محاصل اچھی نوکری کے روپ میں ملے تو اسے مایوسی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ تب اچانک وہ محسوس کرتا ہے کہ اس عرصے میں کہ وہ علم کی کوئی ڈگری حاصل کرنے کی بجائے لوہا کوٹتا، ٹوکری ڈھوتا یا اسی قسم کا کوئی اور دھندا کرتا تو فائدہ مند ہوتا۔ اسے پیٹ بھر روٹی ملتی۔ آزادی ہوتی۔ اطمینان ہوتا اور تم جیسے انٹلکچوئلز اس کے غم میں نہ گھلتے۔ اس کے حق کے واسطے گلا پھاڑ پھاڑ کر دھواں دھار تقریریں نہ کرتے، نظمیں نہ لکھتے، افسانے نہ لکھتے، مجھے بتاؤ کہ تمہیں علم حاصل کر کے کیا ملا؟ فاقے اور عسرت؟ تنگ دستی اور ذلت؟ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کی جستجو؟ آخر کیا ملا؟ تم نے کیا پایا؟ بتاؤ، مجھے جواب دو؟ یہ نظام کی خرابی ہے نا۔'' اس وقت میں نے اپنے دوست کی بات تسلیم نہیں کی تھی۔ مگر اب سوچتا ہوں تو اس مسلّم اور اٹل حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہم محنت کش کے حقوق کے لیے چیختے چلاتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشرے کے دو ہی عناصر امیر اور غریب کے علاوہ ایک تیسرا عنصر بھی ہے جو ہم نے خود پیدا کیا ہے۔ جو تعلیمیافتہ ہے مگر غریب ہے جس کے پاس شعور ہے مگر وسائل نہیں اور جسے محنت کش ہی کہنا چاہیے مگر ہم انکاری ہیں۔ کیونکہ ہم خود کو محنت کش کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ہتک سمجھتے ہیں۔ ہم علم کے زعم میں خود کو غریبوں سے الگ کر لیتے ہیں اور سرمایہ داروں کی نظر میں ہم قابل ملامت ہیں اور یوں یہ طبقہ امارت اور غربت کے دو پاٹوں میں پس کر رہ گیا ہے۔ آج یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی تو کیا۔ جو طبقہ تخلیق پا چکا ہے۔ میں تنہا کیسے اسے مٹا سکتا ہوں۔ اس فرق کو کیسے پاٹ سکتا ہوں۔ میں تو اپنے اور ہمسائے کے گھر کے بیچ کھڑی دیوار کے یہ سوراخ بھی نہیں بھر سکتا اور اس کا گھر دیکھتے ہی دیکھتے چھ عدد بچوں سے بھر گیا ہے۔ ننھی ننھی کلکاریاں اس کے سونے آنگن میں گونجنے لگی ہیں اور اس نے ہنسی خوشی سات جانوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ وہ مطمئن ہے۔ خوش ہے اور مجھے بڑا آدمی سمجھتا ہے صرف اس لئے کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔ میں نے اپنے اندر کا بزدل آدمی اس سے چھپا رکھا ہے۔ اور اسے تو میں ہر ایک سے چھپا کے رکھتا ہوں۔ عاصمہ سے بھی چھپاتا رہا ہوں۔ تبھی تو میں نے عاصمہ سے کہا تھا۔

''عاصمہ میری جان! میں تم سے محبت کر سکتا ہوں۔ تمام زندگی تڑپ کر تمہاری یاد میں کاٹ سکتا ہوں۔ مگر تمہاری مانگ میں افشاں نہیں بھر سکتا۔''

عاصمہ کی آنکھوں سے بہتے چشمے میں دیکھتا رہا مگر اپنی بزدلی ظاہر نہ کر سکا۔ میں بھلا عاصمہ کو کیسے سمجھاتا۔ کیسا بتاتا۔ میں بے گھر ہوں۔ میرا پیٹ خالی ہے میرا ہاتھ بھی خالی ہے اور میرے علم کی اعلیٰ ڈگری الماری میں بند پڑی ہے۔ تب عاصمہ نے مجھے بے وفا کہہ کر اپنی شادی کر لی۔ اپنا گھر بسا لیا۔ جانے اب وہ کس شہر میں ہو گی اور شام ڈھلے بن سنور کر اپنے جیون ساتھی کا انتظار کرتی ہو گی اس کے بچوں کو کھلاتی ہو گی۔ میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ کیسی ہے۔ یقیناً وہ خوش ہی ہو گی۔ اسے خوش رہنا بھی چاہئے اور اس یقین کے سوا میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں جاننا چاہتا کہ مجھے کینسر ہو چکا ہے۔ میرے پھیپھڑے بیکار ہو کر گل گئے ہیں۔ ہاں! میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ڈگری الماری میں پڑی ہے اور میں بے روزگار ہوں۔ دو دن سے بھوکا ہوں۔ میرا پیٹ خالی ہے اور میرا دل ویران ہے۔ میرے ہمسائے کے گھر آج بہت چہل پہل ہے۔ شاید اس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ ہاں اس کے چھوٹے بچے کا عقیقہ ہے۔ صبح مجھے وہ کھانے کی دعوت دینے آیا تھا۔ پر کھانے سے پہلے میں ایک نظم لکھنا چاہتا ہوں۔ ایک ولولہ انگیز نظم۔ جس کے بروقت معاوضے سے میرا کفن دفن ہو سکے۔...... شاید...... اور عبدالرحمٰن مجھے بڑا آدمی ہی سمجھتا ہے۔ شاید......!

دُکھ کی طاقت

انجینئر ظفر محی الدین/ لاہور

وہیل چیئر پر بیٹھے شہر یار نے پہلے اپنی دونوں معذور ٹانگوں کو دیکھا اور پھر اُس نے دیوار پر آویزاں ان تصاویر کو دیکھا جس میں فٹ بال کھیلتے ہوئے وہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دونوں مناظر ایک ساتھ دیکھ کر وہ اکثر مغموم ہو جایا کرتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں جنہیں ضبط کرنا اُس کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ شہر یار بچپن سے ہی چاک و چوبند، پھرتیلا اور ہوشیار تھا۔ سکول میں فٹ بال ٹیم کا کپتان تھا۔ کالج میں پنجاب بھر کے مقابلے میں اُس کی وجہ سے ٹیم نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اُس کے کمرے کی تصاویر میں ایک تصویر میں گورنر پنجاب اُسے گولڈ میڈل پہنا رہے ہیں۔ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی ہونے کی وجہ سے ہی اُسے با آسانی بینک میں جاب مل گئی۔ چند برسوں میں شہر یار نے ملکی سطح پر نام بنا لیا اور قومی ٹیم کا حصہ بنا۔ کئی ملکوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور نمایاں کھیل پیش کیا۔ اُس کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا کہ ایک روز کار حادثے میں وہ زخمی ہو کر دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گیا۔ اُس کی زندگی گھر تک محدود ہو گئی۔ اُس کے مستقبل کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ اب شہر یار کے پاس سنہری یادوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ مایوسی کے گھپ اندھیروں میں چلا گیا۔ دوستوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ گھر سے باہر جاتے اُسے شرمندگی ہوتی۔ کیونکہ پہلے وہ اسٹار تھا اُس کا فین کلب تھا۔ لوگ اُس سے مل کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ اُس کے ساتھ تصاویر بنواتے، آٹو گراف لیتے تھے۔ اب صرف شہر یار پر ترس کھاتے تھے۔ اُسے ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں ''بیچارے کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔''

یہ چیز نیم مردہ شہر یار کو مکمل طور پر مار دیتی۔ اس لیے اُس نے لوگوں کا سامنا کرنا ترک کر دیا تھا۔ وہ جو فٹ بال کے میدان میں مخالف کھلاڑیوں کو بے بس کر دیتا تھا اُس سے اب اپنی بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ قدرت کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ جب سب راستے بند ہو جاتے ہیں اُنہیں بند راستوں میں ایک نیا راستہ نکلتا ہے جو قسمت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک روز شہر یار اخبار پڑھ رہا تھا تو اُس کی نظر چینی رہنما چو این لائی کے اس قول پر پڑی کہ اپنے دکھوں کو اپنی طاقت بناؤ۔ اُسے اس قول کی سمجھ نہ آئی۔ کئی روز تک غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حوصلے سے زندگی گزارو۔ جس حال میں بھی ہو مضبوط رہو اور جو تمہاری زندگی کا کمزور پہلو ہے اُس کو اپنے اور لوگوں کے لیے مفید بناؤ۔ اب شہر یار کو ساری بات واضح ہو گئی اور اُس نے زندگی کی دوبارہ شروعات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ صرف اپنے لیے بلکہ لوگوں کے لیے۔

آج وہ گھر سے باہر نکلا تو اُس کی آنکھوں میں اُمید کی الگ ہی چمک تھی اور جسم میں وہی حوصلہ اور طاقت تھی جو کبھی فٹ بال کے میدان میں اُترتے وقت ہوا کرتی تھی۔ اُس نے معذور افراد کے لیے ایک عظیم ہسپتال بنانے کا فیصلہ کیا اور اُس کی چندہ مہم کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ شہر یار جو لوگوں کا صرف اس وجہ سے سامنا کرنے سے کترانے لگا تھا کہ وہ اُس پر ترس کھائیں گے آج چندہ مانگنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ آج اُسے کوئی احساسِ کمتری نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تو ایک عظیم مقصد کے لیے نکلا تھا۔ لوگ اُس کو جانتے تھے۔ اُس سے محبت کرتے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کی اُس کو اُمید تھی۔ لوگوں نے اُس کی توقع سے بڑھ کر اُس کی امداد کی۔ اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ بڑی تعداد میں نوجوان کھلاڑی اور طالب علم بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں کے افراد اُس کی مہم کا حصہ بنتے چلے گئے۔ شہر یار کو اب زندگی کا نیا مقصد مل گیا تو اُسے زندگی پہلے سے بھی بڑھ کر حسین لگنے لگی، دوران سفر اُسے بے شمار مسافر نواز ملے۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب ہسپتال کے لیے جگہ خرید لی گئی اور اُس کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ رکھ دی گئی اور چند برس بعد وہ دن بھی آ گیا جب ہسپتال کا افتتاح ہوا اور اُس میں معذور افراد کا علاج شروع ہو گیا۔ ایسے معذور افراد جو علاج سے ٹھیک ہو سکتے تھے یا ایسے افراد جن کے پاس ادویات کی رقم نہیں ہوتی تھی اُن کو مفت ادویات فراہم کی جاتی تھیں یا حادثے میں آنے والے وہ لوگ جن کو بروقت علاج کر کے معذوری سے بچایا جا سکتا تھا۔

آج ہسپتال کے لان میں وہیل چیئر پر بیٹھے شہر یار نے پہلے اپنی معذور ٹانگوں کی طرف دیکھا اور پھر سامنے ہسپتال کی وسیع و عریض عمارت کو جہاں لوگ علاج کے لیے آ رہے تھے۔ تو اُس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ بھی کامیابی اور مسرت کے آنسو تھے۔ اُس نے اپنے پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے اُس ناکارہ سے یہ کارِ عظیم لیا تھا۔ بے شک اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے اگر انسان حوصلہ نہ ہارے اور اگر کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو اپنے دکھ کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت بنائے۔

پت جھڑ کی چاپ

عامر بن علی/ جاپان

خزاں کے موسم نے دھرتی کے سینے پر دستک دے دی ہے۔مغربی دنیا میں زرد پتوں کے علاوہ ''ہیلوئین'' کا تہوار بھی اس رت کی پہچان اور امتیازی نشان ہے، جو کہ اب کچھ ہی دنوں کی دوری پر ہے۔ویسے پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات و واقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80٪) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔پہاڑ بھی سرسبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خوردونوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔کہیں ٹولیوں کی شکل میں تو پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ ''ہنامی'' کا لفظی ترجمہ پھول تکنا ہے۔خزاں کے رنگ بدلتے، گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔یوں کہہ لیجئے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو ''مومی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں ''نارا'' عہد کہتے ہیں، اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو ''زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔پسِ دیوارِ زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے، اس نظارے کا سبب سترہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروگار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پردہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے، زرد، خشک، نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔میپل کو اردو اور فارسی میں ''افرا'' کہتے ہیں۔مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک ''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطی کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔اسی لیے مجھے شوکمار بٹالوی کا ''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی۔مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے، پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا، جن پر لدے، پھندے، پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کئے جا رہے تھے۔پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں، جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل وحرکت محدود ہو جاتی ہے۔پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گردونواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے، اور ثقافتی وسماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

امّی آپ کی عظمت کو ڈھیروں سلام

آئینہ مثال

ایک ماں کے لیے بیٹی کے جذبات ہو سکتے ہیں لیکن میں یہ حلفاً کہہ رہی ہوں کہ امی بے حد منفرد ماں تھیں اولاد کے لیے تو وہ محبت کا سمندر تھیں ہی لیکن بہوؤں اور دامادوں کے لیے سگی ماں سے بڑھ کر تھیں، 2021 میں امی آخری بار لیہ گئی تھیں اور یہ میری خوش قسمتی کہ امی تب میرے ساتھ لیہ گئی تھیں اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ امی کے پل پل کی ساتھی تھی میں، 2023 ماہ نومبر امی کو پہلی بار خون کی الٹی آئی ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ انکا جگر فیل ہو گیا ہے اللہ پاک کی طرف سے عطا کردہ زندگی جی رہی تھیں امی ورنہ جگر کام خراب ہو گیا تھا، لیہ سے سسٹر مینا کو بلایا تھا ہم نے، زندگی کے گھمبیر لمحات تھے ایک ماہ بعد امی کو پھر خون کی الٹی آئی اور بس وہ مکمل طور پر بستر سے لگ گئیں، دوائیاں ہی دوائیاں، ہسپتال کے چکر، میری پیاری بہادر ماں جو اپنے بچوں کے لیے ہر محاذ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑی ہو جاتی تھیں انہیں اس طرح بستر پر کمزور، نڈھال اور مدقوق چہرے کے ساتھ پڑا دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا تھا وہ دن قیامت خیز تھا جب امی کو سروسز ہسپتال سے "الشافی ہسپتال" میں وینٹی لیٹر کی وجہ سے شفٹ کرنا پڑا، ہم سب رو رہے تھے باجی ثمر اور انکے بچے بھی ہسپتال آئے ہوئے تھے امی کے بے حد پیارے نواسے انہی کی طرح وفا سے مالا مال ہیں، میرے پیارے خصوصاً" درشہوار امی کے لیے بے حد لجپال ثابت ہوا، اس نے امی کے لیے بھاگ دوڑ کی، سروسز ہسپتال میں تمام وینٹی لیٹر بک ہونے کی وجہ سے امی کو ''الشافی ہسپتال'' منتقل کیا اس دوران مشکور بھائی کمر میں تکلیف کی وجہ سے نڈھال تھا فیصل بھائی چھوٹے بچوں کی وجہ سے مصروف رہنے کے باوجود آ جا رہا تھا امی کی بیماری کے دن نہیں بھولتے، رات بھر امی کو نیند نہ آنا، رات بھر انکا بے چین ہو کر جاگنا، بار بار مشکور کو بھی جگانے کا کہتی تھیں میں اور مشکور جاگتے رہتے تھے، یہ اللہ پاک کا کرم خصوصی کرم رہا کہ ماں کی خدمت کا موقع میسر آیا ورنہ ہم تہی دست رہ جاتے ابا جی کی وفات کے وقت تو ہم بہت چھوٹے تھے نادان تھے انہیں محسوس ہی نہ کر سکے، امی کے ساتھ ہم نے جتنا وقت گزارا میں دعوای کرتی ہوں کہ دینا کی سب سے زیادہ پیار کرنے والی میری امی تھیں، بچوں کی ہر خواہش پہ لبیک کہنے والی، بی اے کے بعد میں نے پنجاب یونیورسٹی میں نے ایم اے اردو کرنے کی خواہش کی تو جھٹ میری خواہش پر عمل درآمد کیا ایم اے اردو کے بعد جب میں نے شعبہ صحافت اختیار کیا تو امی نے میری خواہش کو دیکھتے ہوئے کچھ نہ کہا تھا

امی ہم آپ کی ڈھیروں ڈھیر محبتوں کا قرض تو ادا نہیں کر سکتے نہ آپکے شان شایان خراج تحسین پیش کر سکتے ہیں لیکن میری پیاری امی آخری چند ماہ شدید علالت کے باوجود خدا پاک نے ماہ رمضان کے بابرکت مہینے میں اپکو اپنے پاس بلایا تو میری پیاری امی یہ آپکی بخشش کی علامت ہے آپ نے بھری جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد جس طرح اپنے شوہر سے وفا نبھائی اپنے گھر اور بچوں پہ آنچ نہیں آنے دی ہمیشہ اپنے بچوں کا سر بلند رکھا آپ اللہ پاک کی پیاری ہستی ہیں ابا جی نے زندگی بھر اپکو جو محبت اور پذیرائی بخشی تھی آپ یقیناً" اسکی اہل اور حقدار تھیں کہ آپ نے خود کو ہر دم وفادار ثابت کیا ابو کی وفات کے بعد آپ نے جس طرح اپنے دونوں بیٹوں مشکور اور فیصل کا سر اونچا رکھا اپنے پانچوں بچوں کے لیے زندگی تیاگ دی آپ بیشک عظیم ترین ہیں

امی آپ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں لیکن آپ ہمیشہ ہر موڑ پر ہمارے لیے باعث فخر رہیں ساری زندگی آپ اپنے بچوں کے لیے لاہور رہیں لیکن یہ اللہ پاک کا کرم خصوصی ہے کہ آپ اپنے عظیم شوہر نسیم لیہ کے ساتھ ہی اپنے آبائی قبرستان "شیخ جلال الدین" میں مدفن ہوئیں اپکی آخری رسومات نسیم لیہ۔ کے لیہ میں ہی ہوئیں یقیناً" آپکی روح بہت شاد ہو گی

امی جب اپکی چارپائی کو کندھا دے کر سب جا رہے تھے میں اپنے بھائیوں اور بھانجوں کو دیکھ رہی تھی جن کے حوصلے قابل داد تھے۔ میں نے بھرائے لہجے سے امی کو بے ساختہ آواز دی تھی "امی"

لیکن امی تو خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہو کر جا چکی تھیں میری قابل فخر امی، میدی سرخرو ماں، ایک راز کی بات بتاوں؟ اپکی ایک قبر مبارک ہمارے دل کے اندر بھی بن گئی ہے جہاں ہم جب جی چاہے باضو ہو کر حاضری دیتے ہیں اور بے ساختہ بہنے والے آنسوؤں کی زبان میں اپنا حال دل کہتے رہتے ہیں، میری پیاری امی، آپ کی عظمت کو ڈھیروں سلام

کیا کیا اُڑانے بھرتے ہیں پر کے بغیر بھی
کتنے سفر کیے ہیں سفر کے بغیر بھی
جس میں ترے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا
دیکھا ہے اک جہان نظر کے بغیر بھی
یہ کائنات لگتی ہے اپنا مکاں مجھے
گھر میں رہا ہوں میں سدا گھر کے بغیر بھی
ورنہ تو اپنے آپ سے وحشت سی ہے مجھے
نیکی کا کام کرتا ہوں ڈر کے بغیر بھی
یہ معجزے بھی اس کی محبت میں ہو گئے
شہکار کچھ تراشے ہنر کے بغیر بھی
ہر خاص و عام ملتے ہیں درویش سے جہاں
دربار کچھ تو ہوتے ہیں در کے بغیر بھی
شوکت کسی بھی گھر میں جو ماں کا وجود ہو
رہتی ہے اس میں چھاؤں شجر کے بغیر بھی

افتخار شوکت/لاہور

ادبی خبریں

✧ ممتاز ادیبہ سلمیٰ اعوان کو آثار اکیڈمی کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس خوب صورت تقریب کا اہتمام فلیٹیز ہوٹل میں 20 اپریل کو کیا گیا جس کی صدارت جناب عطاء الحق قاسمی نے کی اور مہمانِ خصوصی جناب اصغر ندیم سیّد تھے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے سعدیہ قریشی، اسامہ صدیق، عظمیٰ سلیم، اشفاق احمد ورک، سعود عثمانی، نیلم احمد بشیر، طاہرہ اقبال، اصغر ندیم سیّد اور عطاء الحق قاسمی نے اظہارِ خیال کیا۔ ایوارڈ کے ساتھ پانچ لاکھ روپے نقد بھی پیش کیے گئے۔ اس تقریب میں لاہور کے ممتاز شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ آخر میں پرتکلف ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ کتاب کے عالمی دن کے موقع پر ادبی جریدے سائبان کے زیر اہتمام بک ہوم پبلشرز کے سامنے کتاب تحریک حوالے سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر مقررین نے کتاب کی اہمیت کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ سائبان کے روح و رواں حسین مجروح نے اپنے ادارے کی کتب 70 فیصد رعایت پر فروخت کیں۔

✧ 21 اپریل 2024ء کو مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ مسلم ٹاؤن میں ادبی تنظیم کارواں کے زیر اہتمام معروف شاعر، ادیب اور اُستاد پروفیسر ڈاکٹر شاہد اشرف کے شعری مجموعے ''رنگ خوابیدہ پڑے ہیں'' کی تقریب پذیرائی منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت جناب نجیب جمال نے کی۔ مہمانِ خصوصی میں ڈاکٹر سعادت سعید، جناب غلام حسین ساجد اور جناب شفقت اللہ مشتاق شامل تھے۔ دیگر اظہارِ خیال کرنے والوں میں انصر منیر، زعیم رشید، شاہد فرید، نوید صادق، ناصر علی، منظر اعجاز اور سعود عثمانی شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر فخر عباس کی ہے۔

✧ انجمن جدت پسند مصنفین کے زیر اہتمام الحمراء ادبی بیٹھک میں معروف شاعر، ادیب اور صحافی ممتاز راشد لاہوری کے 31 ویں شعری مجموعے ''آسودگی'' کی تقریب پذیرائی 23 اپریل 2024ء کو منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت معروف شاعر ندیم الحسن گیلانی ایڈووکیٹ نے کی۔ صاحب شام ممتاز راشد لاہوری کے علاوہ مہمانانِ خصوصی میں محمد عباس مرزا، تاثیر نقوی، ملتان سے معروف شاعرہ گل نسرین و محترمہ رضا ریاض نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض آفتاب خان نے نہایت عمدگی سے سرانجام دیے۔

✧ گلشن ادب کا 43 واں سالانہ مشاعرہ 20 اپریل 2024ء کو عالمی ادارہ برائے پنجابی دیال سنگھ لائبریری نسبت روڈ لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں ملک بھر سے شعرائے کرام نے شرکت کی۔ ادبی کتب پر نقد انعامات اور شیلڈز کے ساتھ ساتھ شعرائے کرام کو رحمت سلطانہ گولڈ میڈلز برائے فروغِ ادب دیا گیا۔

✧ مزاح نگار کرن خان کی کتاب ''محبت فاتح عالم'' کی تقریب ٹی ہاؤس ملتان میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی معروف مزاح نگار گل نوخیز اختر صدارت صائمہ اکرم چوہدری کی تھی جو کراچی سے ملتان تشریف لائیں۔ اظہارِ خیال قمر رضا شہزاد، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی اور سجاد جہانیہ نے کیا۔ صائمہ نورین بخاری، رقیہ اکبر اور روزینہ سعید نے خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کی۔

✧ غضنفر اکیڈمی پاکستان (تلمبہ) علامہ اقبال پبلک اسکول چراغ شاہ میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب میاں حسنین شہزاد نے کی۔ مہمانِ خصوصی قیصر جعفری تھے۔ مہمانِ اعزاز نامور شاعر محمد شاہد نگہ اور سید اسحاق مہدی تھے۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض رفیع اسد نے ادا کیے۔ شعراء نے کلام سنا کر خوب داد وصول کی۔

✧ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (NUML) اسلام آباد میں جشن بہاراں کی رنگا رنگ تقریب منعقد ہوئی۔ اس سلسلے میں مشاعرے کا اہتمام 23 اپریل 2024ء کو ادارے کے آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس مشاعرے کے دو حصے تھے۔ پاکستان کی مقامی اور علاقائی زبانوں کے شاعر ملک کے تمام صوبوں اور کشمیر سے تشریف لائے۔ پہلے حصے کی صدارت پشتو کے شاعر جناب اکبر سیال نے کی۔ دوسرے حصے میں اُردو شاعری پیش کی گئی جس کی صدارت جناب جلیل عالی نے کی۔ مشاعرے کی نظامت جناب اکبر سیال نے کی۔

✧ پاک برٹش آرٹس اور نائس ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام مشاعرے کا انعقاد لاہور میں کیا گیا۔ صدارت نامور شاعر اکرم سحر فارانی نے کی۔ مہمانِ خصوصی ثقلین جعفری، اعظم منیر اور حرا رانا تھیں۔ اس مشاعرے میں لاہور سے باہر کے بھی متعدد شاعروں نے شرکت کی۔

✧ ڈاکٹر دانش عزیز کے شعری مجموعے تشکیک کی تقریب پذیرائی نجم فیلوز کے زیر اہتمام فلیٹیز ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت غلام حسین ساجد نے کی۔ اس تقریب میں ملک گھر سے نامور شعرائے کرام نے شرکت کی۔

❁❁❁

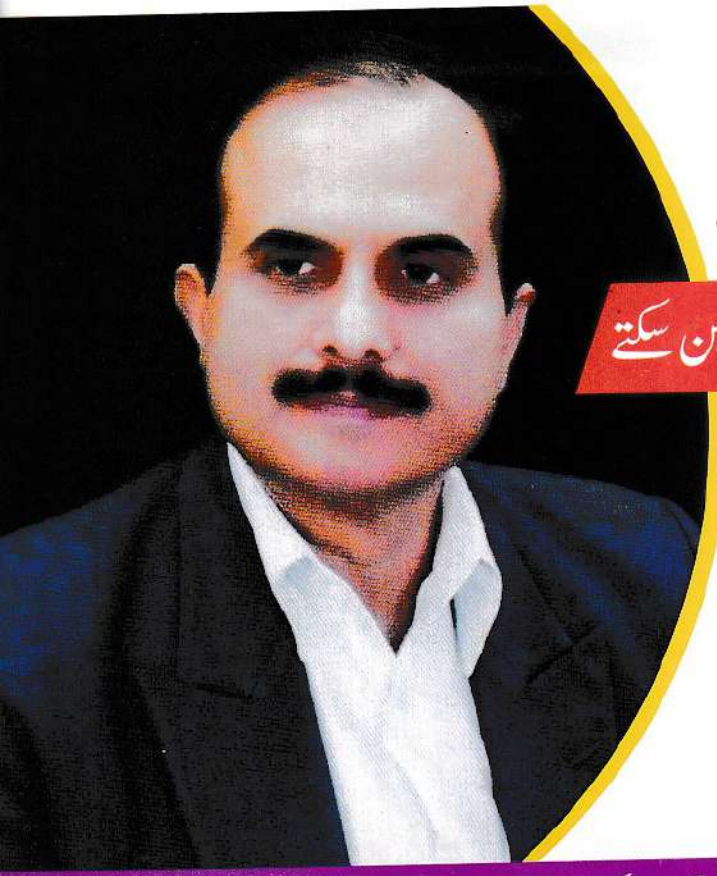

نثری نظم ہماری شاعری پر ڈرون حملہ ہے

جو شاعر محض اپنے دکھ سناتے ہیں وہ بڑے شاعر نہیں بن سکتے

ڈاکٹر ایوب ندیم

سے معروف شاعرہ، کالم نویس اور

مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

عہدِ حاضر کی شاعری میں مجھے گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آتی

ڈاکٹر ایوب ندیم تخلیقی و تصنیفی شعبوں میں شاعری، ڈراما نگاری اور تحقیق و تنقید اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور کے لیے کالم نویسی اور انٹرویو نگاری بھی کی، لیکن اُن کا بنیادی تخلیقی حوالہ شاعری ہے۔ اُن کا شعری سفر 1980ء میں شروع ہوا۔ جلد ہی اُن کی شاعری اُس عہد کے مؤقر ادبی جرائد کی زینت بننے لگی۔ اپنی عملی زندگی میں تدریسی فرائض کے پہلو بہ پہلو گورنمنٹ کالج مصطفیٰ آباد میں بہ طور پرنسپل اور گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں بہ حیثیت صدر شعبہ اردو بھی خدمات انجام دیں۔ اُن کی تصانیف میں (بچوں کے لیے نظمیں)، رات ڈھلتی نہیں (غزلوں کا مجموعہ)، ٹہنیاں تے بور (پنجابی ڈرامے) اور اُجالا حضورؐ کا (نعتیہ مجموعہ) شامل ہیں۔ انہوں نے غزل اور نعت کے ساتھ ساتھ پابند، آزاد اور معرا نظمیں اور سانیٹ بھی لکھے ہیں۔ اُن کی شاعری کی خصوصیات کی بات کریں تو اُن کی شاعری میں ہجر و وصال ہے، آشوب عصر ہے، ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ مابعد الطبیعاتی مضامین ہیں، مزاحمت ہے رجائیت ہے اسلوب میں رمز و ایمائیت کو پسند کرتے ہیں اور فطرت کے گوناگوں رنگوں سے تصویریں بناتے ہیں، جسے آپ امیجری کہتے ہیں۔

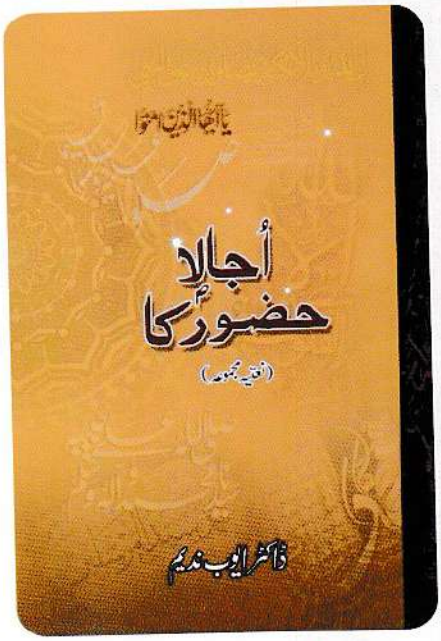

ارژنگ: اپنے تعلیمی، نجی اور ادبی سفر کے بارے میں بتایئے؟

ایوب ندیم: یہ بات میرے لیے باعث طمانیت ہے کہ میرا تعلیمی سفر اچھا رہا۔ میٹرک، بی اے، ایم اے، سبھی امتحانوں میں فسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بی اے میں تو پورے ضلع کے آرٹس گروپ میں اوّل رہا۔ اُس وقت میں خواجہ فرید کالج رحیم یار خان کا طالب علم تھا۔ ایم اے اُردو کے لیے لاہور آیا تو اورینٹل کالج میں میرٹ کے اعتبار سے میرا رول نمبر ایک تھا۔ میں نے ایم اے کے حتمی امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ البتہ ایف اے کے دوران زندگی کا کچھ حصہ طلبہ سیاست کی نذر رہا۔ سٹوڈنٹس یونین کا الیکشن بھی لڑا۔ ایک طلبہ تنظیم کا اعلیٰ عہدے دار بھی بنا۔ یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ اُن دنوں میں سیاست اور ادب کو ایک ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ سیاست میں دشواریاں بھی تھیں، جنرل ضیاء کا دور تھا۔ اپنی مرضی سے بولنے اور لکھنے پر پابندی تھی۔ پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل بھی جاری رہتا، مگر اس میں بھی ایک مزہ تھا، آخر ادبی سرور غالب آ گیا۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں ہی میری شاعری ملک کے اہم ادبی جرائد میں چھپنے لگی تھی، جیسے ڈاکٹر وزیر آغا کا اوراق، صبا لکھنوی کا ''افکار'' اظہر جاوید کا ''تخلیق''، اختر انصاری اکبر آبادی کا ''نئی قدریں''، نعیم صدیقی کا ''سیارہ'' اور سرکاری ادبی رسالہ ''ماہِ نو''۔ گویا میری سیاسی اور ادبی سرگرمیاں ہم رکاب تھیں۔ ان دنوں میں ادبی تقاریب میں نہ صرف شریک ہوتا، بل کہ خود بھی مشاعروں کا اہتمام کرتا رہتا تھا۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

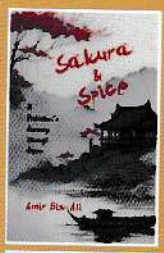

معروف شاعر، منفرد ادیب، مقبول کالم نگار، مترجم و مدیر

عامر بن علی کا تازہ سفرنامہ

مشرق کی طرف دیکھ

مشرق بعید کے اہم ممالک جاپان، کوریا، ملائیشیا، تھائی لینڈ و دیگر کا سفرنامہ

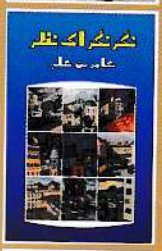

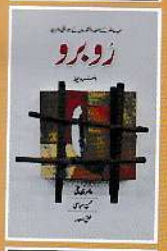

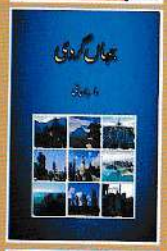

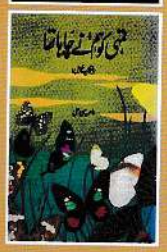

Price 1000 Rupees

شائع ہو گیا ہے

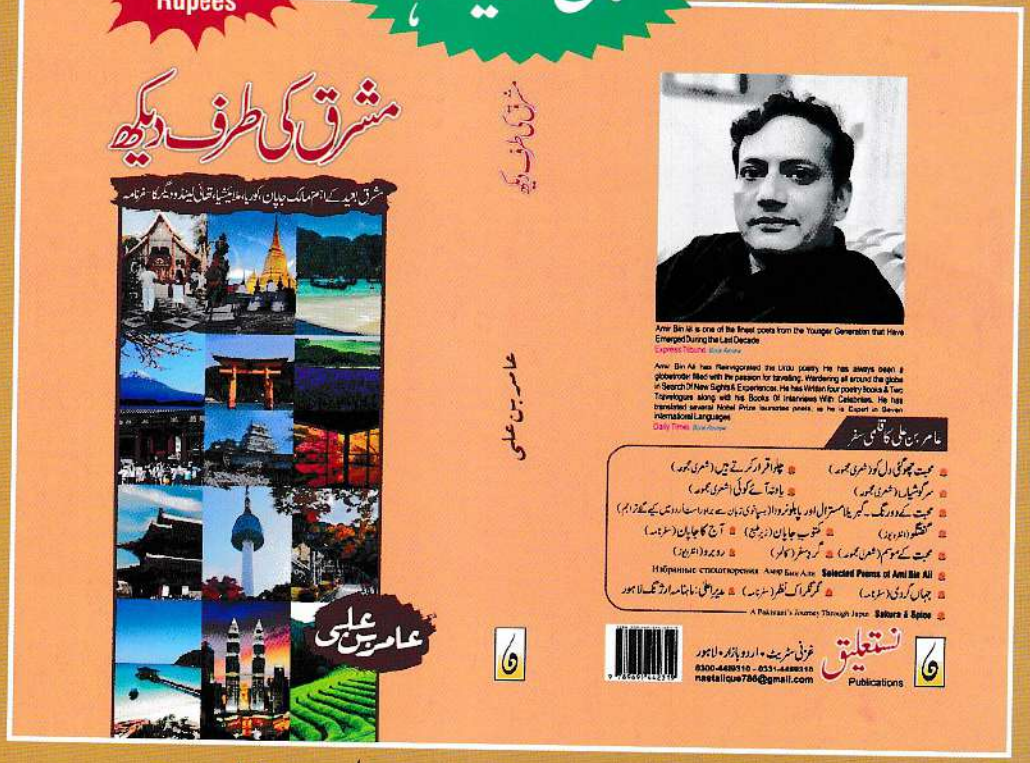

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہے۔

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com